KARL MARX

کارل مارکس

AN INTRODUCTION TO

A CRITIQUE OF POLITICAL ECONOMY

سیاسی معاشیات کی تنقید پر دیباچہ (1)

PREFACE

دیباچہ

میں بورژوا معیشت کے نظام کا اس ترتیب سے جائزہ لینا چاہتا ہوں: سرمایہ، زمین جائداد، مزدوری (اجرتی محنت)، ریاست، غیر ملکی تجارت اور عالمی منڈی۔ پہلے تین عنوانوں کے تحت ان تین بڑے طبقوں کی زندگی کے معاشی حالات کی چھان بین کروں گا جن میں آج کی بورژوا سوسائٹی بٹی ہوئی ہے۔ باقی تینوں عنوانوں کا باہمی تعلق تو ظاہر ہے۔ کتاب اول کا پہلا حصہ جس میں سرمائے سے بحث کی گئی ہے، تین بابوں پر تقسیم ہے:

(1) مال، (2) زر یا روپیہ یا صرف رقم کی گردش، (3) سرمایہ عام طور سے۔

پہلے دو باب میں موجودہ کتاب کا سارا بیان آ جاتا ہے۔ تمام سروسامان میرے سامنے مونوگرافوں کی صورت میں پھیلا ہوا ہے جو مختلف اوقات میں بڑے بڑے وقفوں سے لکھے گئے تھے اور اشاعت کے خیال سے نہیں بلکہ صرف ذاتی وضاحت یا تشریح کی خاطر لکھے گئے تھے۔ اوپر دیے ہوئے نقشے کے مطابق ان مونوگرافوں کا آگے تک پھیلاؤ اس پر منحصر ہے کہ باہر کے حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔

میں نے جو عمومی دیباچے (2) کا خاکہ تیار کر رکھا تھا اسے چھوڑتا ہوں کیوں کہ جب گہرائی تک نظر ڈالی تو میں اس فیصلے پر پہنچا کہ ایسے نتیجوں کا پہلے سے قیاس کر لینا جو ابھی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچے ہیں، الجھاؤ پیدا کرے گا، پس یہی مناسب ہے کہ پڑھنے والا جو میرے ساتھ آنا چاہے وہ خاص سے عام کی طرف بڑھتا چلا آئے۔ البتہ کچھ یادداشتیں جو میں نے اپنے سیاسی معاشی مطالعے کے سلسلے میں تیار کی تھیں، یہاں موقع کے مطابق بیان ہوتی رہیں گی۔

تعلیم میں میرا خاص مضمون تھا قانون، تاہم فلسفے اور تاریخ کے ساتھ ساتھ میں قانون کے مضامین کو ثانوی حیثیت سے سیکھتا رہا۔

43-1842 میں جب Rheinische Zeitung(3) کا ایڈیٹر تھا تو مجھ کو مشکل پیش آئی کہ پہلی بار ان اختلافی سوالوں پر زبان کھولنی پڑی جنہیں، مادی مفاد، کہتے ہیں۔ رائن صوبے کے لاندتاگ (قانون ساز اسمبلی) میں جنگل کی چوریوں اور زمین جائداد کی تقسیم پر جو بحث ہوئی، رائن صوبے کے اس وقت کے "اوبر پریسیڈنٹ" (چیرمین) فان شاپر کی موزیل کے کسانوں کی حالت پر جو سرکاری بحث Rheinische Zeitun اخبار کے ساتھ چلی اور ہوتے ہوتے آخر تجارت کی آزادی اور حفاظتی ڈیوٹی لگانے پر جو مباحثے چھڑ گئے، ان سب نے ٹھوکے دے کر مجھے معاشی اقتصادی سوالوں کا مطالعہ کرنے میں لگا دیا۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ ان دنوں جب "قدم آگے بڑھانے" کی تمنا تو کہیں زیادہ تھی لیکن موضوع کی معلومات بہت کم، Rheinische Zeitung اخبار میں فرانسیسی سوشلزم اور کمیونزم کی گونج بھی سنائی دینے لگی، اگرچہ فلسفیانہ رنگ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ میں نے اس ادھ کچرے پن کے خلاف اظہار خیال کیا لیکن آگس برگ کے اخبار Allgemeine Zeitung(4) سے سوال جواب کرنے میں کھلے طور سے یہ مان لیا کہ فی الحال میری معلومات اتنی نہیں ہیں کہ فرانسیسی رجحانات کی حقیقت پر کوئی فیصلہ دینے کی ہمت کر سکوں۔ اور تو اور میں نے Rheinische Zeitung اخبار چلانے والوں کی اس خوش فہمی سے بروقت اور خوب کام نکالا کہ اگر اخبار نرم یا مصالحت آمیز رویہ اختیار کر لے تو اس کا پھانسی کا پھندا ڈھیلا ہو جائے گا۔ اور میں نے سماجی اکھاڑہ چھوڑ کر مطالعے والے کمرے کا رخ کیا۔

پہلی تصنیف جسے میں نے اپنی الجھنیں دور کرنے کے لئے سامنے رکھا وہ ہیگل کے فلسفہ حقوق کا تنقیدی مطالعہ (کارل مارکس "ہیگل کے فلسفہ حقوق کی تنقید پر" A Contribution to the Critique of Philosophy of Right) تھی جس کا دیباچہ 1844 میں پیرس سے شائع ہونے والے اخبار Deutsch Franzosische Jahrbucher(5) میں شائع ہوا تھا۔ میری تحقیق و تلاش نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا کہ ریاست کی مختلف شکلوں کی طرح حقوق یا قانون کی کڑیوں کو بھی، نہ تو بجائے خود سمجھا جا سکتا ہے نہ اس کی مدد سے سلجھایا جا سکتا ہے جسے انسانی اسپرٹ کی عام اٹھان کہتے ہیں، بلکہ اس کے برخلاف باہمی حقوق کی جڑیں زندگی کے ان مادی تعلقات کے اندر اتری ہوئی ہیں جن کے مجموعے کو ہیگل فلسفی نے اٹھارویں صدی کے انگریز اور فرانسیسی ادیبوں کی دیکھا دیکھی "شہری سماج" کا نام دیا ہے اور اگر اس شہری سماج کے کل پرزے معلوم کرنے ہوں تو سیاسی معاشیات میں تلاش کرنے ہوں گے۔ اس مضمون کا مطالعہ میں نے پیرس میں شروع کیا تھا اور جب وہاں سے مجھے مسٹر گیزو کے حکم سے جلاوطن کیا گیا تو میں برسلز میں بس گیا اور یہاں بھی یہ مطالعہ جاری رکھا۔ میں اپنی تلاش میں جس عام نتیجے تک پہنچا اور جو بعد میں میری تحقیق کے لئے نشان راہ بنتا چلا گیا وہ مختصر طریقے سے یوں پیش کیا جا سکتا ہے: لوگ جب مل کر زندگی میں کسی پیداواری عمل میں حصہ لیتے ہیں تو اس عمل میں لازمی طور سے وہ باہمی تعلقات بھی بنا لیتے ہیں جن میں ان کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا البتہ پیداوار میں یہ تعلقات ان کی مادی پیدا

واری طاقتوں کے اس خاص مرحلے سے (جس پر وہ پہنچے ہوں) ضرور میل کھاتے ہیں۔ پیداوار میں لوگوں کے ان باہمی تعلقات کی کل میزان ہے سماج کا معاشی ڈھانچہ یا وہ اصلی داغ بیل جس پر قانون اور سیاست کی عمارتیں چنی جاتی ہیں۔اور سماجی شعور کی مختلف شکلیں بھی اسی سے مناسبت رکھتی ہیں۔ مادی زندگی کا طریق پیداوار ہی عام طور سے زندگی کی سماجی، سیاسی اور ذہنی عمل کی راہیں متعین کرتا ہے۔ وہ لوگوں کا شعور نہیں ہے جو زندگی کا رخ تعین کرتا ہو بلکہ اس کے برخلاف لوگوں کی سماجی زندگی ان کے شعور کا رخ مقرر کرتی ہے۔ سماج کی مادی پیداواری طاقتیں جب ترقی کر کے ایک خاص مرحلے پر پہنچتی ہیں تو اس وقت کے پیداوار میں قائم شدہ تعلقات سے ان کا ٹکراؤ ہوتا ہے، یا اگر قانونی لفظوں میں کہنا ہو تو یوں کہیں گے کہ پیداواری طاقتیں ملکیت کے ان تعلقات سے ٹکرا جاتی ہیں جن کے ہوتے وہ اب ترقی کرتی رہی تھیں۔ پیداوار میں یہ تعلقات اب تک تو پیداواری طاقتوں کی ترقی کی شکل تھے، اب وہ ان کے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔ تب سماجی انقلاب کا دور شروع ہوتا ہے۔ معاشی اقتصادی بنیاد بدل جانے کے ساتھ کم وبیش تیزی کے ساتھ اوپر استوار عمارتوں کی بھی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ جب اس کایا پلٹ پر غور کیا جائے تو لازم ہے کہ پیداوار کے معاشی حالات میں اس مادی تبدیلی کو، جسے قدرتی سائنسوں کی سی ناپ تول کے ساتھ قطعی طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے، ان قانونی، سیاسی، مذہبی، فنی اور فکری، مختصر یہ کہ ان نظریاتی شکلوں سے شناخت کرنا چاہئے جن کے ذریعے لوگ اس تصادم یا ٹکراؤ کا اظہار کرتے ہیں اور جن میں اس ٹکراؤ سے نکلنے کے لئے طاقت لگاتے ہیں۔ جس طرح ہم کسی آدمی کے متعلق اپنی رائے قائم کرنے میں یہ نہیں دیکھتے کہ وہ خود اپنے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے، عین اسی طرح کایا پلٹ کے کسی خاص دور پر فتویٰ دیتے وقت اس دور کے شعور کو بنیادی وجہ نہیں مان لینا چاہئے۔ اس کے برخلاف ہونا یہ چاہئے کہ اس شعور یا سوجھ بوجھ کی وجہ معلوم کی جائے مادی زندگی کے تضاد میں، اور اس بات میں کہ سماجی پیداواری طاقتوں کے اور پیداوار میں انسانی تعلقات کے درمیان کون سا ٹکراؤ چل رہا تھا۔ کوئی سماجی نظام اس وقت تک تلپٹ نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تمام پیداواری طاقتیں جن کے پنپنے کی اس نظام میں گنجائش ہوتی ہے، خوب پھل پھول نہ چکی ہوں، پیداوار میں نئے اور زیادہ بلند سطح کے تعلقات اس وقت تک کبھی نہیں ابھرتے جب تک کہ اسی پرانے سماج کے وجود کے اندر سے اس کے لئے مادی حالات اور اسباب پک کر تیار نہ ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالم انسانیت اپنے ذمے وہی فریضے لیتا ہے جو وہ پورے کر سکے، چنانچہ اگر زیادہ غور کیا جائے تو ہمیشہ یہ بات کھل کر سامنے آ جائے گی کہ خود فریضہ بھی تبھی سامنے آتا ہے جب اس کے لئے مادی حالات یا تو موجود ہوں یا کم از کم اتنا ہو کہ آگے بڑھتے بڑھتے کسی مقام پر ان کی نوبت آ جائے۔ موٹے اندازے سے یوں کہیں گے کہ ایشیائی قدیم یونانی جاگیرداری اور موجودہ زمانے کا بورژوائی طریقہ پیداوار۔ ان سب کو معاشی سماجی بناؤٹ کے درجہ بدرجہ مختلف دور سمجھنا چاہئے۔ پیداوار میں جو بورژوائی تعلقات ہیں وہ پیداوار کے سماجی عمل میں تناتنی کی ایک آخری شکل ہیں، مطلب یہ نہیں کہ

کوئی ذاتی کشاکش ہے بلکہ اس کا مطلب ہے کہ افراد کی زندگی کے سماجی حالات سے یہ تناتنی اور ٹکراؤ کی صورت نکلتی ہے۔ یہی پیداواری طاقتیں جو بورژوائی سماج کے وجود کے اندر پنپتی ہیں، اس تناتنی سے نکلنے کے مادی حالات واسباب بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ چنانچہ بورژوائی سماجی بناوٹ کے ہاتھوں انسانی سماج کے مقابل تاریخ کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

جب سے فریڈرک اینگلز کا وہ شاندار خاکہ شائع ہوا جو انہوں نے اقتصادی درجوں کی تنقید پر لکھا تھا (فریڈرک اینگلس "سیاسی معاشیات کی تنقید پر ایک نظر" Deutsch Franzosische Jahrbucher اخبار میں) میں ان کے ساتھ خط و کتابت کے ذریعے برابر تبادلہ خیالات کرتا رہا اور اینگلز دوسرے راستے سے (ملاحظہ ہو ان کی تصنیف "انگلینڈ میں مزدور طبقے کی حالت 1844 میں" اسی نتیجے پر پہنچے جس پر میں پہنچا تھا اور جب 1845 میں انہوں نے بھی برسلز شہر کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنالیا تو ہم نے فیصلہ کیا کہ مل کر جرمن فلسفے کے نظریاتی خیالات کے توڑ پر اپنے خیالات کا پورا نقشہ تیار کریں، یا اصلیت میں، اپنے تب تک کے فلسفیانہ ضمیر کا حساب صاف کر دیں۔ اس فیصلے نے عملی جامہ یوں پہنا کہ ہیگل کے بعد کے فلسفے کی تنقید لکھی گئی اس کتاب کا مسودہ (مارکس، اینگلز "جرمن آئیڈیالوجی") جو آٹھ ورق فی جزو کے حساب سے دو موٹی موٹی جلدوں میں تھا، ویسٹ فالیا میں اشاعت کے انتظار میں بہت دن پڑا رہا یہاں تک کہ ہمیں اطلاع دی گئی کہ حالات بدل جانے سے اب اس مسودے کی چھپائی نہیں ہو سکتی۔ ہم نے بڑی خوشی سے وہ مسودہ چوہوں کی کٹیلی تنقید کے سپرد کر دیا کیوں کہ ہمارا جو اصل مقصد تھا کہ مسئلہ اپنی نظر میں صاف ہو جائے، وہ مقصد حاصل ہو چکا تھا۔ اور ان مختلف تحریروں میں سے، جو ہم نے اپنے نقطۂ نظر کی کسی نہ کسی سمت سے تشریح کے خیال سے ان دنوں پبلک کے سامنے پیش کی تھیں، یہاں صرف چند کا تذکرہ کر دوں، ایک وہ، جس کی تصنیف میں اینگلز اور میں شریک ہیں، "کمیونسٹ پارٹی کا مینی فسٹو" اور ایک "تجارت کی آزادی پر بیان" جو خود میں نے شائع کرایا تھا۔ ہمارے خیالات کے فیصلہ کن نکتے پہلی بار علمی طریقے سے، اگرچہ ان میں مناظرے کا رنگ تھا، میری تصنیف "فلسفے کا افلاس" میں پیش ہوئے جو 1847 میں شائع ہوئی اور اس کا رخ تھا فلسفی پرودہوں کے خلاف۔ "مزدوری اور سرمایہ" (اسی سلسلے کے حصہ اول میں شامل ہے۔) نام کا ایک مقالہ، جہاں میں نے اس موضوع پر برسلز جرمن ورکرز سوسائٹی (6) کے سامنے دیے ہوئے اپنے سب لکچر جرمن زبان میں لکھے ہوئے جمع کر دیے تھے، ابھی پریس میں تھا کہ فروری 1848 کے انقلاب (7) اور اس کے بعد برسلز سے میرے نکالے جانے کے سبب اشاعت سے رہ گیا۔

1848 اور 1849 کے زمانے میں Neue Rheinische Zeitung اخبار کی ایڈیٹری نے اور اس کے بعد کے واقعات نے معاشیات پر میرے مطالعے کا سلسلہ توڑ دیا جو لندن پہنچ کر کہیں 1850 میں پھر جاری ہوا۔ برٹش میوزیم میں سیاسی معاشیات کی تاریخ کے موضوع پر جو زبردست ذخیرہ موجود ہے، وہ اور اس کے علاوہ خود لندن جو بورژوائی سماج کا

مطالعہ اور مشاہدہ کرنے کے لئے بڑے موقع کی جگہ ہے اور اوپر سے اس سماج کی ترقی کا تازہ ترین مرحلہ جس میں سب سے تازہ کیلی فورنیا (امریکہ) اور آسٹریلیا میں سونے کی دریافت ہونا شامل ہے، ان حالات نے مجھ سے یہ فیصلہ کرایا کہ پھر شروع سے ہی مطالعہ کرنا چاہئے اور نئے میٹریل میں خوب چھان بین کرنی چاہئے۔ اس طرح لگ کر کام کرنے سے، کچھ تو یہ مطالعہ بجائے خود ایسے سوالوں کی طرف کھینچ لے گیا جو پہلی نظر میں اصل مضمون سے قطعی بے تعلق معلوم ہوتے تھے، لیکن ان پر مجھے تھوڑا بہت اور جم کر کام کرنا پڑا۔ کام کی جتنی مہلت ملی اس کا بھی ایک حصہ یوں کٹ گیا کہ گزر اوقات کے لئے کچھ کام کرنا اور وقت خرچ کرنا پڑتا تھا۔ اب مجھے پہلے انگریزی امریکی اخبار New York Daily Tribune (9 کے لئے کام کرتے آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ (اخبار کے لئے میں یوں بھی کسی خاص وجہ کے بغیر نہیں لکھتا) جس سے میرے علمی مشغلوں میں غیر معمولی خلل پڑتا رہا ہے اور ان کا سلسلہ اکثر ٹوٹتا رہا ہے۔ بہر حال انگلینڈ میں اور یورپ میں اقتصادی زندگی کے نمایاں واقعات پر مضامین لکھنے کی خاطر مجھے اخباروں میں اپنی محنت کا خاصہ بڑا حصہ لگا دینا پڑا اور مجبوراً ایسی عملی تفصیلات سے بھی آگاہی حاصل کرنا ضروری ہو گیا جو سیاسی معاشیات کے اصل علمی مضمون سے باہر کی بات ہیں۔

سیاسی معاشیات کے دائرے میں اپنی مصروفیت اور مطالعے کی رفتار کا جو تذکرہ میں نے یہاں کیا ہے، اس سے صرف اتنا ہی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ میرے یہ خیالات، چاہے ان کے بارے میں کوئی بھی فتویٰ دیا جائے اور حاکم طبقوں کے خود غرضانہ تعصّبات سے چاہے وہ کتنی ہی کم مطابقت رکھتے ہوں، تاہم وہ دیانتداری کے ساتھ برسوں کی تلاش اور ریسرچ کا حاصل ہیں۔ رہا علم تو اس کے دروازے پر بھی باب دوزخ کی طرح یہی نقش ہونا چاہئے کہ:

Qui si convien lasciare ogni sosopetto;

Ogni vilta convien che qui sia morta.

("لرزتے قدموں کا اس جا گزر نہیں ہوتا

نگاہ دل کو یہاں کچھ خطر نہیں ہوتا۔")

لندن، جنوری 1859

یہ دیباچہ برلن 1859 میں شائع ہونے والی کتاب (Zur Kritik der politischen Oekonomie von Karl Marx. Erstes Heft.

شائع ہوئی تھی۔

اُجرت، قیمت اور منافع

Wages, Price, Profit

چند ابتدائی جملے

صاحبان!

نفس مضمون کی طرف آنے سے پہلے، شروعات کے چند جملے کہنے کی اجازت دیجئے۔

فی الحال پورے یورپ میں ہڑتالوں کی ایک وبا پھیلی ہوئی ہے اور اجرت بڑھوانے کی مانگ ہر طرف عام ہے۔ ہماری کانگرس میں یہ سوال زیر بحث آئے گا۔ آپ لوگ جو انٹرنیشنل ایسوسی ایشن (11) کے سربراہ ہیں، آپ کی رائے اس نہایت اہم مسئلے پر خوب جچی تلی ہونی چاہئے۔ لہٰذا میں اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مسئلے کی جڑ بنیاد تک پہنچوں اور اس کی خاطر آپ صاحبان کی قوت برداشت کو امتحان میں ڈالنے کا خطرہ بھی مول لے رہا ہوں۔

شروع کرتے وقت دوسرا ریمارک مجھے ویسٹن صاحب کی بابت دینا ہے۔ انہوں نے مزدور طبقے کے مفاد کی خدمات کے خیال سے نہ صرف آپ کے سامنے بلکہ پبلک کے سامنے کھلے طور پر ایسے خیالات کی حمایت کی ہے جو مزدور طبقے میں، جیسا کہ انہیں خبر ہوگی، انتہائی ناپسندیدہ ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے دل میں اخلاقی جرات کے ایسے اظہار کی بڑی قدر ہونی چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ اگرچہ میری تقریر کا لب ولہجہ تیکھا ہوگا، لیکن اس کے تمام ہونے پر ویسٹن صاحب دیکھ لیں گے کہ میں اس خیال سے اتفاق رکھتا ہوں جس سے انھوں نے (میرا یہ اندازہ ہے) اپنے نظریاتی مقالے کی تیاری وترتیب میں آغاز کیا ہوگا اگرچہ اب جو شکل ان مقالوں کی ابھر کر آئی وہ ایسی ہے کہ میرے خیال میں نظریاتی لحاظ سے باطل اور عملی لحاظ سے خطرناک ہوگی۔

خیر، اب میں سوال زیر بحث کی طرف آتا ہوں۔

1۔ پیداوار اور اجرت

ویسٹن صاحب کا سارا استدلال دو قیاسوں پر رکھا ہوا ہے:

اول یہ کہ ساری کی ساری قومی پیداوار کوئی ایک جامد چیز ہے، اس کی ایک مستقل مقدار یا علم حساب والوں کی زبان میں یوں کہیں کہ ایک قطعی حاصل جمع ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اصل اجرت کی کل رقم، یعنی سب اجرتیں مل ملا کر اس حساب سے جتنا مال وہ خرید سکتی ہوں، وہ بھی ایک جامد رقم ہے اور اس کا حاصل جمع بھی قطعی ہوتا ہے۔

اب یہ پہلا ہی دعویٰ صاف غلط نکلتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سال بسال پیداوار کی ویلیو اور کل مقدار بڑھتی جاتی ہے، قومی محنت کی پیداواری طاقت برابر بڑھ رہی ہے، اور بڑھتی ہوئی پیداوار کو گردش میں رکھنے کے لئے جتنی نقد رقم کا ہونا لازمی ہے، اس کی مقدار بھی لگاتار بدلتی جارہی ہے۔ ایک دوسرے سے مقابلہ یا موازنہ کرتے وقت جو بات پورے سال کے لئے یا مختلف برسوں کے لئے درست ہے، وہی کسی سال کے مختلف دنوں یا ہر ایک دن کے لئے درست ٹھہرتی ہے۔ قومی پیداوار کی کل مقدار یا حاصل جمع لگاتار بدلتی رہتی ہے۔ اس حاصل جمع کو ثبات نہیں، تغیر ہے۔ آبادی کی تعداد میں جو کمی بیشی ہوتی ہے۔ اس سے اگر قطع نظر کر لیا جائے، تب بھی قومی پیداوار کی کل مقدار ایک حال پر اس وجہ سے نہیں رہ سکتی کہ سرمائے کا ذخیرہ ہونا اور محنت کی پیداواری طاقت یہ دونوں لگاتار بدلتے رہتے ہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ اگر کسی روز اجرتوں کا عام معیار چڑھ جائے تو چاہے بعد میں کچھ بھی نتیجے نکلیں، تاہم صرف اس معیار کے چڑھ جانے سے پیداوار کے حاصل جمع پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو صورت حال اس وقت ہوگی شروع میں اسی کی بنیاد پر کام چلتا رہے گا۔ لیکن اگر قومی پیداوار اجرتیں بڑھ جانے سے پہلے تک کوئی جامد نہیں بلکہ متحرک یا بدلتی رہنے والی کل مقدار ہے تو پھر اجرتیں بڑھ جانے کے بعد بھی وہ جامد نہیں بلکہ متحرک ہی رہے گی۔

اچھا فرض کریں کہ قومی پیداوار کی کل مقدار متحرک نہیں بلکہ جامد یا ایک حال پر رہنے والی ہے۔ تب بھی وہ بات جسے ہمارے دوست ویسٹن ایک منطقی نتیجہ سمجھ رہے ہیں لفظی الٹ پھیر کے سوا اور کچھ نہیں ٹھیرتی۔ اگر ایک مقررہ عدد ہمارے سامنے ہے، فرض کیجئے آٹھ ہے، تو آٹھ کے عدد کی جو واقعی حد ہے، اس کے اندر رہ کر باقی دوسرے عدد اپنی باہمی نسبت آسانی سے بدل سکتے ہیں۔ اس آٹھ کے عدد میں اگر منافع کا عدد چھ ہے اور اجرت کا دو تو یہ ممکن ہے کہ اجرت بڑھ کر چھ ہو جائے اور منافع دو رہ جائے۔ یوں بھی دونوں کی جمع آٹھ ہوگی۔ پس معلوم ہوا کہ پیداوار کی کل مقدار کے بدلنے کا کسی صورت میں بھی یہ مطلب نہیں نکلتا کہ اجرتوں کی کل مقدار بھی ایک حال پر رہی ہو۔ اس صورت میں ہمارے دوست ویسٹن کیونکر ثابت کرتے ہیں کہ اجرت کی کل مقدار ایک حال پر رہتی ہے؟ ثابت ہی نہیں کرتے، اس پر اصرار کرتے ہیں، چلئے، ان کا یہ اصرار بھی مان لیا۔ تب تو اسے دونوں سمتوں میں کارگر ہونا چاہیئے، لیکن وہ صرف ایک سمت میں اسے کارگر دکھاتے ہیں۔ اگر اجرتوں کی کل مقدار ایسی حاصل جمع کا نام ہے جو بدلتی نہیں، تو پھر نہ وہ بڑھنی چاہیے، نہ گھٹنی۔ مطلب یہ کہ اگر مزدور عارضی طور سے اپنی اجرتیں بڑھوانے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی یہ حرکت معقول نہیں ہے، تب سرمایہ داروں کی بھی یہ حرکت نامعقول ہوئی کہ وہ عارضی طور سے ان کی اجرتیں گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے دوست ویسٹن کو اس سے انکار نہیں کہ خاص حالات میں مزدور یہ کر سکتے ہیں کہ سرمایہ داروں کو مجبور کر کے اپنی اجرتیں بڑھوالیں، لیکن چونکہ اجرتوں کی کل مقدار قدرتی طور سے معین معلوم ہوتی ہے، اس لیے اجرتیں بڑھوالینا آخر رنگ لائے گا۔ دوسری طرف سے وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ سرمایہ دار یہ

کر سکتے ہیں کہ اجرتیں گھٹا دیں اور سچ پوچھئے تو وہ مستقل اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔لیکن اجرتوں کی مجموعی مقدار ایک حا ل پر رہنے کا اصول یہ کہتا ہے کہ اجرتیں گھٹانا بھی، اجرتیں بڑھوا لینے کی طرح رنگ لاتا ہے۔ چنانچہ اجرتیں گھٹائے جانے یا گھٹانے کی کوشش ہونے کے جواب میں محنت کش صحیح کارروائی کرتے ہیں۔ان کی طرف سے یہ صحیح کارروائی ہے کہ اپنی اجر تیں بڑھوائیں کیونکہ اجرتیں گھٹانے کی جوابی کارروائی یہی ہوگی کہ اجرتیں بڑھوانے کے لئے کارروائی کی جائے۔ ویسٹن صا حب کے نزدیک اجرتوں کے ایک حال پر رہنے کا اصول یہ کہتا ہے کہ محنت کشوں کو بعض خاص حالات میں یہ کرنا چاہیے کہ اجر تیں بڑھوانے کے لئے متحد ہوں اور اس کی پوری کوشش کریں۔

اگر انہیں اس نتیجے سے انکار ہے تو پھر جس قیاس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے اسی قیاس سے انکار کریں۔انہیں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اجرتوں کی کل مقدار ایک جامد مقدار ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اجرتوں کی کل مقدار نہ تو بڑھ سکتی ہے اور نہ اسے بڑھنا چا ہیے البتہ جب بھی سرمایہ مناسب جانے، وہ گھٹ سکتی ہے اور اسے گھٹ جانا چاہیے۔اگر سرمایہ دار کے دل میں نیکی آئے کہ وہ آپ کو گوشت کی جگہ آلو اور گیہوں کے بجائے جو کھلائے تو آپ اس کی یہ مرضی سیاسی معاشیات کا قانون سمجھ کر پوری کیجئے ا وراس کے سامنے سر جھکا دیجئے۔اب اگر ایک ملک میں اجرتیں دوسرے ملک کی اجرتوں سے زیادہ ہیں، مثلاً یہ کہ ریاست ہا ئے متحدہ امریکہ میں انگلینڈ سے زیادہ ہیں تو آپ اجرتوں کے معیار کے اس فرق کی یہ تشریح کر سکتے ہیں کی امریکی سرمایہ دار کی مرضی اور برطانوی سرمایہ دار کی مرضی میں فرق پڑتا ہے، یہ ایسی ترکیب ہے جو صرف معاشی اقتصادی مظاہر کو ہی نہیں بلکہ ا ور تمام مظاہر کے مطالعے کو بھی بے حد آسان اور سیدھا سادہ بنا دیتی ہے۔

پھر اس معاملے میں بھی ہم وہی سوال اٹھا سکتے ہیں: آخر امریکی سرمایہ دار کی مرضی برطانوی سرمایہ دار کی مرضی سے مختلف کیوں ہے؟ اس کا جواب دینے کے لیے آپ کو مرضی کے دائرے سے باہر کہیں جانا پڑے گا۔ایک پادری یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا کی مشیعت فرانس میں اور ہے اور انگلینڈ میں کچھ اور۔اس پر بھی اگر میں اصرار کروں کہ آخر پروردگار کے ہاں مشیعت کی یہ د وئی کیوں ہے تو وہ ہچکچائے بغیر جواب دے سکتا ہے کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے، فرانس میں اس کی ایک مرضی ہے، انگلینڈ میں دوسری۔مگر ظاہر ہے کہ ہمارے دوست ویسٹن اس قسم کی دلیل میں پناہ نہیں لینے والے جہاں کسی طرح کے استدلال کی گنجائش نہ رہے۔

اس میں شک نہیں کہ سرمایہ دار کی مرضی ہے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ وصول کر سکے، کر لے۔لیکن ہمارا کام یہ نہیں کہ اس کی مرضی کی تشریح کرتے پھریں بلکہ ہمارا کام یہ ہے کہ سرمایہ دار کی طاقت کا کھوج لگائیں، اس طاقت کی حدوں کا اور ان حدوں کی نوعیت کا پتہ لگائیں۔

(2) پیداوار، اجرت اور منافع

ویسٹن صاحب نے جو خطبہ ہمیں سنایا ہے اس کا لب ولباب پیش کیا جا سکتا ہے۔

ان کی ساری دلیلیں گھوم پھر کر یہیں آتی ہیں کہ: اگر مزدور طبقہ سرمایہ دار طبقے کو مجبور کر کے نقد اجرت کی صورت میں چار کے بجائے پانچ شلنگ وصول کرتا ہے تو سرمایہ دار اس کے جواب میں جو سامان دے گا وہ پانچ کا نہیں، چار شلنگ کی مالیت کا ہوگا۔ اب مزدور طبقے کی جیب سے اسی سامان کے پانچ شلنگ جائیں گے جس کے وہ اجرت بڑھنے سے پہلے چار شلنگ دیا کرتا تھا۔ مگر ایسا ہوتا ہی کیوں ہے؟ سرمایہ دار پانچ شلنگ کے بدلے میں صرف چار شلنگ کی مالیت کا سامان ہی کیوں دیتا ہے؟ کیونکہ اجرت کی رقم مقرر ہے۔ مگر وہ چار شلنگ کی مالیت کے سامان پر ہی کیوں ٹھہری ہوئی ہے؟ تین یا دو شلنگ یا کسی اور رقم پر کیوں مقرر نہیں؟ اگر اجرت کی رقم کی حد کسی معاشی قانون سے طے پاتی ہے، وہ نہ سرمایہ دار کی مرضی کی تابع ہے، نہ محنت کش کی مرضی کی پابند۔ تو ویسٹن صاحب کو پہلا کام یہ کرنا چاہیے تھا کہ وہ قانون بیان کریں اور اسے ثابت کر دیں۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بھی ثابت کرنا چاہیے تھا کہ اجرت کی رقم جو کسی ایک وقت میں ادا کی جاتی ہے وہ ہمیشہ اتنی ہی ہوتی ہے جسے لازمی رقم شمار کیا جائے۔ اس تناسب سے کبھی ادھر یا ادھر نہیں ہوتی۔ اب اگر ایسا ہوتا کہ اجرت کی موجودہ رقم کی حدیں یا تو سرمایہ دار کی محض ذاتی مرضی پر منحصر ہوتیں یا اس کے لالچ کی حدوں کی پابند ہوتیں تو یہ حدیں من مانی ہیں، ان میں کچھ بھی لازمی اور قطعی نہیں، سرمایہ دار کی مرضی کے مطابق بھی بدل سکتی ہیں اور مرضی کے خلاف بھی۔

ویسٹن صاحب نے اپنے نظریے کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ اگر ایک دیگچی میں شوربے کی مقررہ مقدار سماتی ہے جو گنتی کے مقررہ آدمیوں کے لئے تیار کی گئی ہے، چمچہ یا کفگیر اگر اور بڑا ہو جائے تو اس سے شوربے کی مقدار نہیں بڑھ جائے گی۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ اس مثال میں چمچہ بہت پھرا دیا گیا ہے۔ اس پر مجھے ایک ایسا ہی واقعہ یاد آ گیا جسے مینینی آگریپا نے بیان کیا ہے۔ جب روم کی رعایا (plebeians) نے روم کے آقاؤں (patricians) کے خلاف ہڑتال کی تو آقا آگریپا نے ان سے کہا کہ پیٹریشین (مالک) پیٹ سے ملک کے بدن کے پلیبین (رعیت) اعضا کو غذا پہنچتی ہے۔ تاہم وہ یہ کہنے سے چوک گیا کہ ایک کا پیٹ بھر کر دوسرے کے اعضا کو غذا پہنچائی جا سکتی ہے۔ ویسٹن صاحب بھی چوک گئے کہ جس دیگچی سے محنت کشوں کو غذا ملتی ہے وہ قومی محنت کی پوری پیداوار سے بھری جاتی ہے، وہ چیز جو انھیں دیگچی میں سے کچھ زیادہ لینے سے روکتی ہے وہ دیگچی کا چھوٹا ہونا یا اس کے اندر کا کال تھوڑا ہونا نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ ان کے چمچے چھوٹے ہیں۔ وہ کونسی ہوشیاری ہے جس سے ایک سرمایہ دار یہ راستہ نکال لیتا ہے کہ چار شلنگ کی مالیت پانچ شلنگ میں دے؟ جو مال اسے فروخت کرنا ہے اس کی قیمت بڑھا کر یہ راستہ نکالا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قیمت کا بڑھنا، بلکہ عام طور سے مال کی قیمتوں کا گھٹنا بڑھنا یا مال کی قیمتیں محض سرمایہ دار کی مرضی پر منحصر ہیں؟ یا یوں ہے کہ اس مرضی کو عمل میں لانے

کے لئے کچھ اوہ شرطوں کا ہونا لازم ہے؟ اگر ان حالات کا، ان شرائط کا تقاضا نہ ہو تو بازار بھاؤ کا تیز یا مندا ہونا، اس کا لگا تار بدلتے رہنا ایک بن بوجھی پہیلی بن جائے۔

اگر ہم فرض کر لیتے ہیں کہ نہ تو محنت کی قوت پیداوار میں کوئی تبدیلی ہوئی، نہ سرمائے اور محنت کی اس مقدار جو لگی ہوئی ہے میں کوئی فرق پڑا، نہ روپے کی اس مالی حیثیت میں فتور آیا جس کے ذریعے سامان کی قیمتیں لگائی جاتی ہیں۔ بلکہ صرف اجرت کے معیار میں فرق آیا ہے تو پھر وہ کون سا طریقہ ہے جس سے اجرتوں کے بڑھ جانے کا اثر مال کی قیمتوں پر پڑ جاتا ہے؟ اجرتوں کا بڑھنا قیمتوں پر صرف اسی صورت میں اثر ڈالتا ہے کہ مال کی مانگ اور سپلائی کے درمیان جو اصلی نسبت ہے اس نسبت کو متاثر کر دیتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ مزدور طبقہ۔ اس کی پورے تعداد نظر میں رکھئے تو۔ اپنی آمدنی سب سے مقدم ضروریات پر خرچ کرتا ہے اور اس خرچ پر مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے جوں ہی اجرتوں کا معیار عام طور پر اونچا اٹھتا ہے، ضروریات کی اب سے مقدم چیزوں کی مانگ بھی بڑھ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ بازار بھاؤ بھی اسی کے ساتھ بڑھ جاتے ہیں۔ بازار میں آنے والا یہ سامان جن سرمایہ داروں کے ہاتھ سے نکلتا ہے، وہ اگر ایک طرف اجرت بڑھاتے ہیں تو دوسری طرف اپنے سامان کے بازار بھاؤ بڑھا کر حساب برابر کر لیتے ہیں۔ مگر ان سرمایہ داروں کا کیا بنے گا جو سب سے مقدم ضروریات کا سامان تیار نہیں کرتے؟ ایسے سرمایہ دار کچھ کم ہوں گے، یہ سوچنا بھی نہیں چاہئے۔ اگر آپ یہ دھیان میں رکھیں کہ قومی پیداوار کی سوتہائی کا استعمال آبادی کا صرف پانچواں حصہ کرتا ہے۔ بلکہ حال میں ہی دارالعوام کے ایک ممبر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ آبادی کا صرف ساتواں حصہ ان کا استعمال کرتا ہے۔ تو سوچنے کی بات ہے کہ قومی پیداوار کا کتنا زبردست حصہ صرف عیش و آسائش کے سامان کے طور پر تیار کیا جاتا ہے یا ایسے سامان سے اس کا تبادلہ کیا جاتا ہے، اور مقدم ضروریات زندگی کا کتنا زبردست حصہ ہوگا جو فالتو خدمتگاروں پر، گھوڑوں، بلیوں وغیرہ پر ضائع کیا جاتا ہے۔ ہمیں اپنے تجربے سے معلوم ہے کہ جوں ہی مقدم ضروریات زندگی کے سامان کے بھاؤ بڑھنے لگتے ہیں، اس فضول خرچی کی حدیں ہمیشہ سکڑ جاتی ہیں۔

خیر، تو ان سرمایہ داروں کی پوزیشن کیا ہوگی جو ضروریات زندگی کا سامان تیار نہیں کرتے؟ کیونکہ اجرتیں عموماً بڑھ جانے سے ان کے منافع کی شرح تو گرے گی اور وہ اپنے مال کے بھاؤ بڑھوا کر اس لئے حساب برابر نہیں کر سکتے کہ اس مال کی مانگ نہیں بڑھتی۔ ایسے سرمایہ داروں کی آمدنی گھٹے گی اور گھٹنے پر بھی انہیں ضروریات کا مہنگا سامان خریدنے کے لئے زیادہ خرچ کرنا پڑے گا۔ مگر یوں نہیں ہوتا۔ جب ان کی آمدنی گھٹتی ہے تو انہیں عیش و آسائش کے سامان پر اپنا خرچ گھٹانا پڑتا ہے اور اس صورت میں خود انہی کے اپنے مال پر آپس میں ایک دوسرے کی مانگ بھی گھٹتی چلی جاتی ہے۔ ہوتے ہوتے نتیجہ یہ کہ ان کے مال کی قیمتیں گرتی ہیں۔ اس کا اثر یہ کہ صنعت کی ان شاخوں میں منافع کی شرح اتر جاتی ہے اور یہ اجرتوں کا معیار

عام طور پر بڑھ جانے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ اجرتوں کا معیار عموماً بڑھ جانا، مقدم ضروریات کی چیزوں کے بھاؤ چڑھ جانا اور عیش و آسائش کے سامان کی قیمتوں کا گر جانا، سب مل کر اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ صنعت کی مختلف شاخوں میں لگے ہوئے سرمایوں کو جب منافع کی شرح میں یہ فرق پڑے کا تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ لازمی بات ہے کہ وہی نتیجہ نکلے گا جو چاہے کسی حالت میں بھی ہو اور کسی سبب سے بھی ہو، لیکن پیداوار کے مختلف دائروں میں اوسط شرح منافع پر فرق پڑنے سے نکلتا۔ سرمایہ اور محنت دونوں کم نفع کی شاخوں سے نکل کر زیادہ نفع والی شاخوں کا رخ کرتے ہیں اور ایک سے دوسری میں ڈھلنے کا یہ سلسلہ تب تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ صنعت کی بعض شاخوں میں مال کی سپلائی بڑھتی ہوئی مانگ سے میل نہ کھائے اور صنعت کی دوسری شاخوں میں سپلائی کم ہوتے ہوتے گھٹی ہوئی مانگ کے برابر نہ آجائے۔ جب دونوں پلڑوں میں یہ ادل بدل ہو چکتی ہے تو صنعت کی مختلف شاخوں میں شرح منافع کا اوسط ایک سا ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ ساری اونچ نیچ شروع ہوئی تھی صرف اس بات سے کہ مختلف مالوں کی رسد اور طلب کے باہمی توازن میں فرق پڑ گیا تھا، لہذا سبب دور ہونے پر اس کا اثر بھی جاتا رہا اور قیمتیں پھر پہلے کی سطح پر اور باہمی توازن پر پہنچ گئیں۔ منافع کی شرح کا گرنا، جو اجرتیں بڑھنے کا نتیجہ ہوتا ہے، صنعت کی بعض شاخوں تک محدود رہنے کے بجائے سب میں عام ہو جاتا ہے۔ ہم نے جو فرض کیا تھا اس کی رو سے، نہ تو محنت کی قوت پیداوار میں فرق پڑا، نہ پیداوار کی کل میزان میں، البتہ تیار ہونے والے سامان کی کل مقدار کی صرف شکل بدل گئی۔ چنانچہ اب تیار ہونے والے سامان کا بڑا حصہ سب سے مقدم ضروریات زندگی کی شکل میں موجود ہے اور تھوڑا حصہ آسائش کے سامان کی صورت میں، یا اسی کو یوں کہیں کہ تھوڑا حصہ ایسا ہے جو عیش و آسائش کے بدیسی سامان سے بدلا جا رہا ہے اور بیشتر اپنی اصل شکل میں ہی کھپ جاتا ہے، یا پھر اسی بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ دیسی پیداوار کا بڑا حصہ ایسا ہے جو آسائش کے سامان کے بدلے میں نہیں بلکہ بدیسی سامان ضرورت کے تبادلے میں جاتا ہے۔ لہذا جب اجرتوں کا معیار عام طور سے اونچا ہوتا ہے تو بازار کے بھاؤ میں تھوڑی بہت اونچ نیچ ضرور آتی ہے، لیکن اس کے اثر سے صرف منافع کی شرح عام طور پر گر جاتی ہے۔ البتہ یہ نہیں ہوتا کہ مال کی قیمتوں میں کوئی مستقل تبدیلی ہو جائے۔

اگر مجھ سے کہا جائے کہ اوپر جو دلیل دی ہے اس میں یہ فرض کر کے چلا ہوں کہ اجرت میں جتنا اضافہ ہوگا وہ سارے کا سارا مقدم ضروریات زندگی پر خرچ ہو جائے گا تو جواب میں مجھے یہ کہنا ہے کہ میں نے فرض کرنے میں ویسٹن صاحب کی سہولت کو مدنظر رکھا ہے۔ اگر اجرت کے اضافے کی رقم ایسی چیزوں پر خرچ ہونے لگے جو مزدور پہلے استعمال نہیں کیا کرتے تھے تو پھر یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ مزدوروں کی اصل قوت خرید بڑھ گئی۔ تاہم چونکہ ان کی قوت خرید کا یہ اضافہ محض اجرت کے بڑھنے کا نتیجہ ہے، اس لئے جس نسبت سے اجرت بڑھے اسی نسبت سے سرمایہ داروں کی قوت خرید گھٹنی چاہئے۔ اگر ایسا ہوتا تو مال کی جتنی مانگ ہوتی ہے اس کا عام ناپ تول نہ بڑھتا بلکہ مانگ کے اندر ضروریات اور آسائش کے

سامانوں کا تناسب بدل جاتا۔ ایک طرف سے پلہ جھکتا تو دوسری طرف سے اٹھ جاتا۔ اور پھر چونکہ مانگ کی مجموعی مقدار جوں کی توں بنی رہتی تو مال کے بازار بھاؤ میں بھی کوئی فرق نہیں پڑنا چاہئے تھا۔ یہاں ایک اور گتھی پڑتی ہے: یا تو یوں ہے کہ اجرتوں کا اضافہ استعمال کی سبھی چیزوں پر مساوی حیثیت سے خرچ ہوتا ہے، اس صورت میں مزدور طبقے کی طرف سے مانگ بڑھنے میں سرمایہ دار طبقے کی طرف سے مانگ گھٹنا لازم آتا ہے، یا پھر یوں ہے کہ اجرتوں کا اضافہ استعمال کی صرف بعض چیزوں پر خرچ ہوتا ہے جن کا بازار بھاؤ عارضی طور سے تیز ہو جاتا ہے، اس صورت میں صنعت کی بعض شاخوں میں شرح منافع کا گرنا یہ رنگ لائے گا کہ سرمایہ اور محنت اپنے اپنے ٹھکانے بدلیں اور تب تک بدلتے رہیں جب تک کہ کسی کسی صنعت میں سپلائی بڑھی ہوئی مانگ سے میل نہ کھائے اور دوسری صنعت میں گھٹتے گھٹتے وہ نہ آ جائے۔ اگر ہمارا پہلا فرض درست ہے تو مال کی قیمتوں میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہونے والی، اور اگر دوسرا درست ہے تو بازار بھاؤ میں تھوڑی بہت اونچ نیچ ہونے کے بعد مال کی قوت تبادلہ وہیں آ کر ٹھہرے گی جہاں وہ پہلے تھی۔ دونوں مفروضوں کا حاصل یہ ہوا کہ اجرتوں کا عام معیار بڑھ جانے سے اگر کوئی آخری نتیجہ نکلنے والا ہے تو وہ صرف اسی قدر ہے کہ شرح منافع عام طور سے گر جائے۔

آپ کے تخیل پر زور دینے کی خاطر ویسٹن صاحب تجویز کرتے ہیں کہ ذرا آپ غور فرمائیں اور ان مشکلات کا اندازہ کریں جو انگلستان کے فارموں میں کام کرنے والوں کی اجرت نو کے بجائے اٹھارہ شلنگ کر دینے سے پیش آئیں گی۔ وہ آپ کو چونکاتے ہیں کہ ذرا غور تو کیجیے؛ ایسا ہوا تو مقدم ضروریات زندگی کی مانگ کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی اور اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ قیمتیں بڑھتے بڑھتے بھیانک حد کو پہنچیں گی۔ آپ صاحبان واقف ہیں کہ امریکہ کے فارموں میں کام کرنے والوں کا اوسط اجرت انگلستان کے فارموں کے مزدوروں سے دوگنے سے بھی کچھ زیادہ ہے اگرچہ امریکہ میں زراعتی پیداوار کا سامان برطانیہ عظمیٰ کے مقابلے میں سستا ہے، اور محنت اور سرمائے کے درمیان عام تعلقات امریکہ میں بھی وہی ہیں جو انگلینڈ میں ہیں، اگرچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سالانہ پیداوار انگلینڈ کی۔ سالانہ پیداوار بہت کم ہے۔ تو پھر ہمارے یہ دوست کیوں خطرے کی گھنٹی بجا رہے ہیں؟ صرف اس خیال سے کہ ہمارے سامنے جو اصل سوال ہے وہ ٹل جائے۔ اجرت کا نو سے ایک دم اٹھارہ شلنگ ہو جانے کا مطلب یہ ہوا کہ اجرت ایکا ایکی سو فیصدی بڑھ جائے۔ مگر سوال زیر بحث یہ ہے ہی نہیں کہ کیا انگلستان میں اجرت کا عام میعار ایک دم سو فیصدی بڑھ سکتا ہے؟ ہمیں اس بات سے قطعی کوئی واسطہ نہیں کہ اجرت کا اضافہ کس قدر ہو کیونکہ جہاں بھی یہ سوال اٹھے گا خود وہاں کے حالات پر منحصر ہوگا اور انہی کی مناسبت سے وہ فیصلہ ہوگا۔ ہمیں تو صرف اتنی بات صاف کرنی ہے کہ اگر اجرتوں کا میعار عام طور سے بڑھے، چاہے وہ ایک فیصدی سے بھی آگے نہ بڑھے، چاہے وہ ایک فیصدی سے بھی آگے نہ بڑھے، تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

ہمارے دوست ویسٹن نے اجرت میں سو فیصدی اضافے کے جو خیالی گھوڑے دوڑائے ہیں، انہیں رد کر کے میں آپ

کی توجہ اس طرف لانا چاہتا ہوں کہ 1849 سے 1859 کے عرصے میں برطانیہ عظمی کے اندر اجرتیں واقعی کتنی بڑھی ہیں۔

آپ سب پر روشن ہے کہ 1848 میں دس گھنٹے کام کا بل پیش کیا گیا تھا(12)۔ یہ ایک نہایت اہم اقتصادی تبدیلی تھی جو ہماری آنکھوں کے سامنے آئی۔ اس بل کا مطلب تھا کہ اجرتیں ایک دم اور لازمی طور سے بڑھائی جائیں، کسی ایک مقامی کاروبار میں نہیں بلکہ صنعت کی ان نمایاں شاخوں میں جن کے سہارے انگلستان عالمی منڈی پر حاوی ہو گیا ہے۔ اجرتوں میں یہ اضافہ ایسے حالات میں کیا گیا جو نہایت ہی ناسازگار تھے۔ ڈاکٹر یور، پروفیسر سینئر اور ان تمام ماہرین معاشیات نے جو بورژوازی کے حق میں سرکاری ترجمانی کرتے ہیں، ثابت کو دیا تھا، بلکہ میں کہوں کہ ہمارے دوست مسٹر ویسٹن کی منطقی دلیلوں سے کچھ زیادہ ہی گہرے اتر کر ثبوت فراہم کر دیے تھے کہ دس گھنٹے کام کے بل نے انگریزی صنعت کی موت کی سنانی دی ہے۔ انہوں نے ثابت کیا تھا کہ یہ صرف اجرتیں بڑھانے کا سیدھا سا معاملہ نہیں ہے بلکہ اجرتوں میں اس قسم کے اضافے کا سوال ہے جو لگنے والی محنت کی مقدار کم کیے جانے کا نتیجہ بھی ہے اور اس پر مبنی بھی۔ ان لوگوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ سرمایہ دار کے ہاتھ سے جو کام لینے کا بارہواں گھنٹہ چھینا جا رہا ہے، یہ وہی گھنٹہ ہے جس سے وہ اپنا منافع وصول کرتا ہے۔ انہوں نے ڈرایا کہ سرمائے کا ذخیرہ کم ہونے لگے گا، قیمتیں چڑھ جائیں گی، منڈیاں ہاتھ سے نکل جائیں گی، پیداوار گھٹے گی، اس کا اثر یہ پڑے گا کہ اجرتیں گریں گی اور آخر میں بربادی پھیلے گی۔ انہوں نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ میکسی میلیاں روبس پیئر نے جو قوانین (Maximum Laws) (13) بنائے تھے وہ اس کے سامنے ہیچ تھے، اور ایک معنی میں ان کا کہنا تھا بھی سچ۔ لیکن پھر انجام کار کیا ہوا؟ فیکٹریوں میں کام کرنے والوں کی نقد اجرتیں بڑھ گئیں حالانکہ کام کے گھنٹے کم ہو گئے تھے؛ کارخانے کے مزدوروں کی تعداد میں خاصا نمایاں اضافہ ہو گیا؛ کارخانوں میں بننے والے مال کی قیمتیں برابر کم ہوتی چلی گئیں؛ کارخانے کے مزدوروں کی قوت کارکردگی میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا؛ کارخانوں کے تیار شدہ مال کی منڈیاں رفتہ رفتہ اتنی پھیل گئیں کہ پہلے کبھی گمان نہ تھا۔ 1870 کی بات ہے، مانچسٹر میں سائنس کی ترقیوں کی سوسائٹی کا ایک جلسہ تھا، جہاں میں نے خود مسٹر نیومین کو یہ اقرار کرتے سنا کہ وہ بذات خود، ڈاکٹر یور اور پروفیسر سینئر اور علم معاشیات کے تمام سرکاری نمائندے غلط نکلے، مگر عام لوگوں کی فطری سوجھ بوجھ صحیح ثابت ہوئی۔ میں پروفیسر فرینسس نیومین کے متعلق نہیں کہہ رہا ہوں، میرا روئے سخن ہے مسٹر ڈبلیو نیومین (14) کی طرف، جو معاشیات کے علم میں ایک بلند پایہ رکھتے ہیں، وہ تھومس ٹوک کی کتاب " قیمتوں کی تاریخ" میں مصنف کے شریک بھی ہیں اور ایڈیٹر بھی۔ یہ ایک شاندار تصنیف ہے جو 1793 سے 1856 تک کی قیمتوں کی تاریخ کا سراغ لگاتی ہے۔ اگر ہمارے دوست ویسٹن کے دماغ میں بیٹھا ہوا خیال صحیح ہوتا کہ اجرتوں کی کل مقدار ایک حال پر رہتی ہے، پیداوار کی کل مقدار، محنت کی پیداواری طاقت اور سرمایہ داروں کی مرضی، یہ اور دوسری چیزیں ایک حال پر قائم، بے تغیر اور قطعی رہتی ہیں تو پروفیسر سینئر کی وہ حسرت ناک پیس گوئیاں بھی کب

کی صحیح ثابت ہو جاتیں اور رابرٹ اوون غلط نکلتا جس نے اب سے بہت پہلے 1815 میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کام کے گھنٹوں کا کم کیا جانا مزدور طبقے کی نجات "شرط اول قدم" ہے(15)۔اس نے عام تعصب کے سامنے سینہ سپر ہو کر اور ذاتی خطرہ مول لے کر نیو لنارک کے مقام پر اپنی ذاتی کپڑا مل میں مزدوروں کے کام کے گھنٹے کم کر کے دکھا دئے تھے۔

عین اس وقت جب دس گھنٹے کام کا قانون بنا اور اس کی بدولت اجرت میں اضافہ ہوا تو برطانیہ عظمی میں کچھ ایسے اسباب سے جن کا تفصیلی ذکر یہاں بے موقع ہوگا، فارموں میں کام کرنے والوں کی اجرتیں بھی عام طور سے بڑھتی نظر آنے لگیں۔

اس وقت جو مقصد میرے پیش نظر ہے، اگر چہ یہ اس کا تقاضا نہیں ہے تاہم اس خیال سے کہ میری بات کا غلط مفہوم نہ نکالا جائے، یہاں میں کچھ ابتدائی نکتے جتا دینا چاہتا ہوں۔

اگر کسی شخص کو ہفتے میں دو شلنگ ملتے تھے اور اب اس میں اضافہ کی وجہ سے بڑھ کر چار شلنگ تک پہنچ گئی تو اجرت کا معیار سو فیصدی بڑھا۔ اگر اضافے کے معیار کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اجرت میں زبردست اضافہ ہو گیا لیکن حقیقت میں اجرت کی کل رقم ہوئی چار شلنگ فی ہفتہ، جو بجائے خود کچھ حیثیت نہیں رکھتی، پیٹ بھرنے کو بھی کافی نہیں۔اس لئے اجرت کے ناپنے میں فیصدی کے بلند بانگ اضافی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا کچھ مناسب نہیں۔ ہمیشہ ہمارا سوال یہ ہوگا کہ اجرت کی اصل مقدار کتنی تھی؟

اب آگے دیکھئے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اگر دس مزدور ہفتے میں فی کس دو شلنگ پاتے ہیں، 5 مزدور 5 شلنگ فی ہفتہ پاتے ہیں اور 5 مزدور 11 شلنگ فی ہفتہ تو بیس آدمی کو ملا کر سو شلنگ یا پانچ پونڈ فی ہفتہ وصول ہوتا ہے۔ان کے ہفتہ بھر کی اجرت کی مجموعی رقم میں بیس فیصدی اضافہ کیا جائے تو پانچ کی جگہ انھیں چھ پونڈ ملیں گے۔اس کا اوسط نکالیں تو ہم کہیں گے کہ اجرت کا عام معیار بیس فیصدی بڑھا لیکن درحقیقت دس مزدوروں کی اجرت وہی رہی جو تھی، پانچ آدمی کے گروپ کی اجرت بڑھی تو فی کس پانچ کے بجائے چھ شلنگ تک ملنے لگی، اور دوسرے پانچ آدمی کے گروپ کی اجرت کی مجموعی رقم 55 سے 70 شلنگ ہوگئی۔مزدوروں کی آدھی تعداد کی حالت ذرا بھی بہتر نہیں ہوئی، چوتھائی تعداد کی حالت ذرہ بھر بہتر ہوئی، صرف باقی چوتھائی کو واقعی اجرت کے اضافے کا فائدہ پہنچا۔تاہم اگر مجموعی رقم کے حساب سے اوسط نکالی جائے تو ان بیس مزدوروں کی اجرت میں بیس فیصدی کا اضافہ ہوا۔ چونکہ یہ معاملہ پورے سرمائے کا ہے جو ان مزدوروں کو کام پر لیتا ہے اور ان کے بنائے ہوئے مال کی قیمتوں کا ہے، اس لئے انداز ایسے ہے کیا جائے گا گویا اجرت کا اوسط اضافہ سارے مزدوروں کو یکساں پہنچ گیا ہے۔اوپر کی مثال میں اگر فارموں میں کام کرنے والوں کو رکھا جائے جن کی اجرتیں انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے الگ الگ تعلقوں میں بالکل علیحدہ معیار رکھتی ہیں تو مزدوروں میں اجرتوں کے بڑھنے کا انداز ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہوگا۔

آخری بات یہ کہ جن دنوں اجرتوں میں یہ اضافہ ہوا، اسی زمانے میں کئی ایسے واقعے پیش آئے جنھوں نے مخالف سمت

میں اپنا وزن ڈالا، مثلاً: نئے ٹیکس لگے جو روس سے جنگ (16) کا تقاضا تھے، فارموں میں کام کرنے والوں کے مکان بڑے پیمانے پر ڈھائے گئے (17) وغیرہ وغیرہ۔

اتنا کچھ جتا دینے کے بعد، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ 1849 سے 1859 کے درمیانی عرصے میں برطانیہ عظمیٰ کے اندر فارموں کے کام کرنے والوں کا اوسط اجرت قریب قریب چالیس فیصدی بڑھا ہے۔

میں اپنے اس دعوے کی تائید میں بہت وسیع پیمانے پر اور تفصیلی مواد پیش کرتا، لیکن پیش نظر مقصد کے لیے فی الحال اتنا ہی کافی ہے کہ مرحوم جان مارٹن نے لندن سوسائٹی آ آرٹس (18) کے جلسے میں جو نہایت محنت، تحقیق اور چھان بین کے بعد لکھا ہوا مقالہ 1860 میں پیش کیا تھا اور جس کا عنوان تھا "زراعت میں استعمال ہونے والی طاقتیں" اسی کا حوالہ دے دوں۔ مسٹر جان مارٹن نے اسکاٹ لینڈ کے بارہ اور انگلینڈ کے 35 تعلقوں میں رہنے والے تقریباً سو کاشتکاروں کے بہی کھاتے، حساب اور باضابطہ کاغذات جمع کر کے ان سے اپنے نتیجے نکالے ہیں۔

ہمارے دوست ویسٹن صاحب کے خیال کے مطابق، خاص کر اگر یہ بھی نظر میں رکھا جائے کہ کارخانے کے مزدوروں کی اجرتیں بھی اس عرصے میں بڑھی ہیں تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ 1849 اور 1809 کے درمیان زراعتی پیداوار کی قیمتیں کہیں سے کہیں پہنچ جاتیں۔ مگر دراصل ہوا کیا؟ حالاں کہ روس سے جنگ بھی چل رہی تھی اور 1804 سے 1856 کی کئی فصلیں بھی خراب گئیں، پھر بھی انگلینڈ کی اصل زراعتی پیداوار یعنی گیہوں کی اوسط قیمت جو 1838 اور 1848 کے درمیانی عرصے میں تقریباً تین پونڈ فی کوارٹر تھی، گر کر 1849 اور 1859 کے درمیانی برسوں میں دو پونڈ دس شلنگ فی کوارٹر تک جا پہنچی۔ مطلب یہ کہ جب فارموں میں کام کرنے والوں کی اجرت کا اوسط چالیس فیصدی بڑھا ہے، اسی وقت گیہوں کی قیمت سولہ فیصدی سے بھی کچھ نیچے گر گئی۔ اب اگر ایک سرے کو دوسرے کے سامنے رکھا جائے یعنی 1849 کا 1809 مقابلہ کیا جائے تو سرکاری رجسٹروں کے ذریعے پتہ چلتا ہے کہ 1849 میں اگر مفلس قلاشوں کی تعداد 934419 تھی تو گھٹ کر 860470 رہ گئی، یعنی دس سال بعد 73949 مفلس کم تھے۔ مانتا ہوں کہ یہ کمی کچھ خاص قابل شمار نہیں اور بعد کے برسوں میں وہ پھر نہ ہونے کے برابر پہنچ گئی۔ تاہم کم تو ضرور ہوئی تھی۔

کہہ سکتے ہیں کہ اناج کی قانونی پابندی (19) ہٹنے کے بعد 1849 سے 1859 کے درمیان سرحد پار سے اناج کی درآمد اتنی ہو گئی جو 1838 اور 1848 کے درمیانی عرصے کے مقابلے میں دوگنی تھی۔ تو پھر کیا ہوا؟ ویسٹن صاحب کے نقطۂ نظر سے تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ سرحد پار کی منڈیوں میں اناج کی یہ زبردست اندادھند اور لگاتار بڑھتی ہوئی مانگ زراعتی پیداوار کی قیمتوں کو آسمان پر پہنچا دیتی کیونکہ بقول ان کے بڑھی ہوئی مانگ کا اثر جوں کا توں رہتا ہے چاہے یہ مانگ ملک کے اندر سے اٹھی ہو یا باہر سے۔ لیکن حقیقت میں کیا ہوا؟ اس تمام عرصے میں سوائے ان برسوں کے جب فصل بگڑ گئی، فرانس

میں مستقل فریاد بلند رہی کہ اناج کے بھاؤ چوپٹ ہوئے جارہے ہیں، امریکیوں نے مجبوراً کئی بار اپنی فالتو پیداوار جلا ڈالی، اور اگر مسٹر اورکاٹ کا بیان صحیح ہے تو روس نے ہی ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں خانہ جنگی (20) کو ہوا دی ہے کیونکہ یورپ کی منڈیوں کیں امریکیوں کے مقابلے نے روس کی زراعتی پیداوار کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

اب اگر ویسٹن صاحب کے استدلال کو ایک عام کلیے کی شکل دی جائے تو وہ یوں ہوگی: مانگ میں ہر قسم کی بڑھوتری تبھی ہوتی ہے جب سامان یا پیداوار کی اتنی مقدار مہیا ہو۔ لہٰذا مانگ بڑھنا کسی حالت میں بھی استعمالی سامان کی سپلائی نہیں بڑھا سکتا البتہ روپے کی شکل میں اس کی قیمت بڑھا سکتا ہے۔ تاہم بڑے معمولی مشاہدے سے بھی یہ بات روشن ہے کہ بعض موقعو ں پر مانگ کے بڑھنے سے مال کے بازار بھاؤ بالکل نہیں بدلتے اور بعض موقعوں پر عارضی طور سے بھاؤ چڑھ جاتے ہیں اور اس کی بدولت سپلائی بھی بڑھ جاتی ہے سپلائی بڑھ جانے کی وجہ سے قیمتیں اپنے پہلے کے معیار پر اتر جاتی ہیں بلکہ بعض موقعو ں پر اس سے بھی نیچے۔ یہ مانگ کا بڑھنا اجرت کا بڑھنے کے سبب ہوتا ہے یا کسی اور وجہ سے، اصل مسئلے پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ویسٹن صاحب کے نقطہ نظر سے یہ اسی قسم کا ایک عام مظہر ہے جسے سمجھانا مشکل ہے جیسے انہونے واقعات کی صورت میں یعنی اجرتوں کے بڑھ جانے کی حالت میں پیش آتا ہے۔ لہٰذا جو مسئلہ ہمارے زیر غور ہے، اس میں ویسٹن صاحب کا استدلال قطعی طور پر کچھ ثابت نہیں کرتا۔ ان کے استدلال سے صرف یہ راز کھلتا ہے کہ ایسے اصولوں اور قانونوں کا پتہ لگانا ان کے بس کی بات نہیں جن کے تحت مانگ بڑھ جانا سپلائی بڑھنے کا تقاضا کرتے ہے اور ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ بازار بھاؤ بھی بڑھ جائیں۔

مزدوری اور نقد رقم

بحث کے دوسرے دن ہمارے دوست ویسٹن صاحب نے اپنا پرانا عقیدہ نئے لباس میں پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ: جب اجرت بڑھتی ہے تو اس بڑھی ہوئی اجرت کو ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ زیادہ نقدی ہاتھ میں ہو۔ اگر نقدی میں کمی بیشی نہیں ہوتی تو پھر اس نہ بدلنے والی مجموعی رقم میں سے اجرت کی وہ مجموعی رقم کیسے ادا ہوگی جو پہلے سے بڑھ چکی ہے؟ پہلے یہ مشکل درپیش تھی کہ مزدور کے حصے میں خریداری کے لئے جو سامان آتا ہے وہ اتنے کا اتنا ہی رہا حالانکہ نقد اجرت بڑھ گئی۔ اب دوسری دشواری کا سامنا ہے کہ مزدور کی نقد اجرت تو بڑھ گئی لیکن سامان کی مقدار نہیں بڑھنے پاتی۔ ظاہر بات ہے کہ اگر آپ ویسٹن صاحب کے خیال کی بنیادی اینٹ کھسکا دیں تو اوپر کی دوسری الجھنیں خود بخود نکل جائیں گی۔

پھر بھی میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ نقد رقم کے بارے میں جو سوال ہے اسے زیر بحث مسئلے سے دور دور کوئی واسطہ نہیں۔

آپ کے ملک میں روپے کے لین دین کی چول اس کمال کے ساتھ بٹھائی گئی ہے کہ یورپ کے کسی ملک میں اس کی

مثال نہیں ملتی۔ بینکوں کا سسٹم اس خوبی کے ساتھ پھیلا ہونے اور سب کڑیاں جڑی ہونے کی بدولت یہ سہولت حاصل ہے کہ جتنی مالیت کو گردش میں رکھنا ہے، یا جتنی رقم کا کاروبار جاری رکھنا ہے، اتنی یا اس سے زیادہ رقم کا کاروبار چلانے کے لئے کہیں کم نقدی کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثال لیجئے، اجرت کا معاملہ یوں ہے: انگلستان میں کارخانے کا مزدور ہر ہفتے جو اجرت پاتا ہے وہ لاکر دوکاندار کے حوالے کرتا ہے، دوکاندار ہر ہفتے یہ رقم بینکر کو بھیج دیتا ہے، وہ ہر ہفتے کارخانہ دار کو لوٹا دیتا ہے جو پھر اپنے مزدوروں کو ادا کر دیتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس مشینی عمل کا کرشمہ ہے کہ مزدور کی سال بھر کی اجرت، فرض کیجئے اگر باون پونڈ ہو، تو وہ محض ایک اشرفی (گنی) کے گھماؤ سے ادا ہو سکتی ہے کیونکہ یہی ایک پونڈ ہر ہفتے گھوم گھوم کر باون ہفتے پورے کر لے گا۔ انگلستان میں بھی یہ مشینی عمل اتنا پختہ نہیں جتنا سکاٹ لینڈ میں۔ اور پھر یہاں بھی ہر جگہ اس کی کارکردگی یکساں مکمل نہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مثلاً جن حلقوں میں صرف کارخانے ہیں، ان کے مقابلے میں بعض دیہاتی حلقوں کے اندر کہیں کم مجموعی مالیت کو گردش میں رکھنے کے لئے کہیں زیادہ نقد رقم کی ضرورت پڑتی ہے۔

اگر آپ چینل پار کر کے یورپ کی طرف جائیں تو دیکھیں گے کہ وہاں نقد اجرتیں انگلستان کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ پھر بھی جرمنی، اٹلی، سوئزرلینڈ اور فرانس میں ان اجرتوں کی ادائیگی کے لئے کہیں زیادہ نقد رقم کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہاں نہ تو ہر اشرفی اتنی تیزی سے بینکر کے ہاتھ میں پہنچتی ہے اور نہ اس تیز رفتاری سے گھوم پھر کر سرمایہ دار کے پاس آ جاتی ہے۔ اس لئے بجائے ایک اشرفی کے جو سال بھر کا چکر کاٹ کر باون پونڈ کا کام کر دیتی ہے، یورپ کے براعظم میں ممکن ہے تین اشرفیوں کی ضرورت پڑے تاکہ سال بھر تک نقد اجرت کی صورت میں پچیس پونڈ ادا کئے جائیں۔ اس طرح انگلستان سے یورپ کے ملکوں کا موازنہ کرتے ہوئے آپ فوراً یہ بات نکال سکتے ہیں کہ کم تر اجرتوں کے لئے اس سے زیادہ نقد رقم کی ضرورت پڑ سکتی ہے جتنی زیادہ اجرتیں دینے کے لئے پڑتی ہے۔ اور حقیقت میں یہ سوال محض ٹیکنیکل ہے جس کا ہمارے موضوع سے قطعی کوئی تعلق نہیں۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے بزیادہ سے زیادہ صحیح شمار کے حساب سے انگلستان کے مزدور طبقے کی سالانہ اجرت کا اندازہ 20 کروڑ پونڈ بیٹھتا ہے۔ یہ زبردست رقم قریب قریب تیس لاکھ پونڈ نقدی کی مدد سے ادا کی جاتی ہے۔ فرض کیجئے اجرتیں پچاس فیصدی بڑھا دی جاتی ہیں تو جہاں تیس لاکھ پونڈ کی رقم لگتی ہے وہاں پنتالیس لاکھ پونڈ کی ضرورت پڑے گی۔ اب چونکہ مزدور اپنے روزمرہ کے خرچ کا زیادہ تر حصہ چاندی اور تانبے کے سکوں میں ادا کرتا ہے، یعنی ان معمولی سکوں میں جن کی قدر و قیمت سونے کی نسبت اسی طرح قانون کے حکم سے مقرر ہوتی ہے تو اجرتوں کے پچاس فیصدی بڑھائے جانے میں حد سے حد یہی ہونے والا ہے کہ جتنی اشرفیوں کی کمی پڑتی وہ اور گردش میں شامل کر دی جائیں، یہ رقم یوں کہئے کہ دس لاکھ اشرفی ہو گی۔ فرق یہی ہوا کہ دس لاکھ اشرفی جو فی الحال سونے کی سلاخوں کی یا سکوں کی صورت میں بینک آف انگلینڈ کے یا

پرائیویٹ بینکروں کے تہہ خانوں میں پڑی ہے، وہ چلنے لگے گی۔اس دس لاکھ اشرفی کا سکہ ڈھالنے میں یا سکہ گھسنے پٹنے میں جو برائے نام خرچ ہوتا ہے اس خرچ کی بھی کفایت کی جاسکتی ہے اور ایسی حالتوں میں جب سکے کی گردش بڑھنے کے سبب سے کہیں رکاوٹ پڑتی ہے تو یہ کفائت کر لی جاتی ہے۔آپ کو علم ہے کہ انگلستان میں جو زر گردش میں رہتا ہے، اس کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ایک قسم میں تو وہ زر آجاتا ہے جس میں ہر طرح کے بینک نوٹ شامل ہیں جو تجارت پیشہ لوگوں کے درمیاں چلتے ہیں اور ذرا بڑی بڑی ادائیگیوں کے لئے استعمال کرنے والوں اور تاجروں کے درمیان ہاتھ بدلتے رہتے ہیں دوسری قسم کا زر وہ ہے جس میں دھات کے سکے ہیں اور چھوٹے لین دین میں چلتے ہیں۔اگر چہ گردش میں رہنے والے زر کی یہ دونوں قسمیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، تاہم ایک دوسرے پر سے پھلانگی رہتی ہیں۔سونے کے سکے کا عام چلن ہے اور جہاں پانچ پونڈ سے کم کسی طاق رقم کی ذرا بڑی ادائیگی کرنی ہے وہاں بھی اسی سے کام لیا جاتا ہے۔اگر کل کو چار، تین یا دو پونڈ کے بینک نوٹ جاری کر دئے جائین تو سونے کے یہ سکے جو پانچ پونڈ سے نیچے کی ادائیگی میں جا بجا چل رہیں، فوراً یہ جگہیں چھوڑ دیں گے اور اس طرف کا رخ کریں گے جہاں نقد اجرتیں بڑھ جانے کی وجہ سے ان کی ضرورت محسوس ہونے والی ہے۔اس طرح سے پچاس فیصدی اجرت بڑھنے کے نتیجے میں جو مزید دس لاکھ اشرفی درکار ہے وہ ایک اشرفی بڑھائے یا بنائے بغیر ہی دستیاب ہو جاتی ہے۔یہی نتیجہ بینک نوٹ کی گنتی بڑھائے بغیر حاصل کیا جاسکتا ہے، صرف زیادہ سرکاری بونڈ گردش میں لانا ہوں گے جیسا کہ لنکا شائر میں کافی زمانے تک ہوتا رہا۔

اگر اجرتوں کے میعار کا عام طور سے بلند ہونا، مثلاً سو فیصدی بلند ہونا، جیسا کہ ویسٹن صاحب نے فارموں پر کام کرنے والوں کے سلسلے میں سوچا ہے، مقدم ضروریات زندگی کی چیزوں کی قیمتیں کافی بڑھا دیتا ہے اور، ویسٹن صاحب کے نظریے کے مطابق، اوپر سے اور نقد رقم طلب کرتا ہے جو حاصل نہیں کی جاسکتی تو اجرتوں کے عام طور سے گرنے کا اثر بھی ایسا ہی اور اسی حد تک ہونا چاہئے، لیکن اس کے بالکل الٹ۔لاجواب بات! آپ سب واقف ہیں کہ 1808 سے 1860 کا زمانہ سوتی کپڑا ملوں کی صنعت پھلنے پھولنے کا زمانہ تھا، خاص طور سے 1860 تو ایسا سال گذرا ہے کہ تجارت کی پرانی یادداشتوں میں کہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔پھر یہی وہ زمانہ ہے جب صنعت کی دوسری شاخوں نے بھی پہلے سے کہیں زیادہ فروغ پایا۔سوتی ملوں کے مزدوروں کی اجرت اور اسی سے دوسری صنعتی شاخوں میں اجرت کا معیار اتنا بڑھا ہوا تھا جو پہلے کبھی نہیں پہنچا۔اتنے میں امریکی بحران آیا اور ان تمام مزدوروں کی اجرتیں ایکا ایکی ایسی گریں کہ پہلے کے مقابلے میں تقریباً چوتھائی رہ گئیں۔اس کے برخلاف ہوتا تو یہ تین سو فیصدی بڑھنا کہلاتا کیوں کہ اگر اجرت پانچ سے بیس ہو جائے تو ہم اسے تین سو فیصدی بڑھنا کہتے ہیں۔اور اگر وہ بیس سے پانچ رہ جائے تو ہم کہیں گے کہ پچھتر فیصدی گھٹ گئی۔ایک واقعے میں اس کا بڑھنا، دوسرے میں اس کا گھٹنا دونوں کی رقم ایک ہی ہے یعنی پندرہ شلنک اجرت کے معیار میں۔اس وقت یہ ایسی

اچانک انجانی تبدیلی آئی تھی اور پھر مزدوروں کی اتنی وسیع تعداد کو اس نے اپنی لپیٹ میں لیا تھا کہ اگر ان سب مزدوروں کو شمار کیا جائے، ان کو بھی جو براہ راست سوتی ملوں میں لگے ہوئے تھے، اور ان کو بھی جو اس صنعت کے سہارے بسر کرتے تھے تو یہ تعداد زراعی فارموں میں کام کرنے والوں سے ڈیڑھ گنی ہوتی ہے۔ تو کیا گیہوں کی قیمت گر گئی؟ نہیں، بلکہ 1858 سے 1860 کے تین برسوں میں قیمت کا سالانہ اوسط 47 شلنگ 8 پینس فی کوارٹر رہا تھا تو 1861۔1863 کے تین برسوں میں قیمت کا اوسط بڑھ کر 55 شلنگ 10 پینس فی کوارٹر ہو گیا اور جہاں تک سکے کا تعلق ہے تو ٹکسال میں صرف 1861 میں 8673232 پونڈ بنا کر نکالے گئے، حالانکہ 1860 کے یہ مقدار 3378102 پونڈ تھی۔ دوسرے لفظوں میں 1861 کے دوران 5295130 پونڈ کا سکہ زیادہ ڈھالا گیا۔ صحیح ہے کہ 1861 میں جتنے بینک نوٹ چل رہے تھے ان کی تعداد 1860 کے مقابلے میں 1319000 پونڈ کم تھی۔ اس پوری رقم کو منہا کر دیں، تب بھی بہر حال 1861 میں جو زر گردش میں تھا وہ 1860 کے خوشحالی والے سال کے مقابلے میں 3976130 یا تقریباً چالیس لاکھ پونڈ زیادہ ہی تھا رہا سونے کا محفوظ ذخیرہ تو بینک آف انگلینڈ کے پاس وہ اس عرصے میں گھٹ گیا۔ اگرچہ اس میں اتنا گھاٹا نہیں آیا، تاہم اس کے قریب قریب کمی پڑی۔

1862 کا 1842 سے مقابلہ کر کے دیکھیں۔ علاوہ اس کے کہ جو مال گردش میں تھا اس کی مالیت اور مقدار بھی بڑھ کر کہیں سے کہیں پہنچی، لیکن اگر صرف سرمائے کو لیجئے تو انگلینڈ اور ویلز میں ریلوے کے بونڈ پر لگے ہوئے حصوں، قرضوں اور دستاویزی رقموں وغیرہ کا سرمایہ بڑھتے بڑھتے 1862 میں 32 کروڑ پونڈ کو پہنچ گیا اور یہ وہ رقم تھی جو 1842 میں فرضی داستان معلوم ہوتی۔ پھر بھی زر کی عام مقدار جو 1842 اور 1862 میں گردش میں تھی وہ قریب قریب اتنی ہی تھی۔ ویسے بھی گردش کرتے ہوئے زر نقد کو رفتہ رفتہ کم کرنے کا رجحان دکھائی دیتا ہے، حالانکہ مال کی جملہ مالیت بھی بے انتہا بڑھ گئی ہے اور مالیاتی لین دین کا پھیلاؤ بھی زبردست ہو گیا ہے۔ ہمارے دوست ویسٹن کے نقطہ نظر سے یہ ایک بن بوجھی پہیلی ہے

۔

وہ ذرا نظر سے اور گہرائی میں اترتے تو انہیں پتہ چلتا کہ اگر اجرت کو بالکل ایک طرف رکھ دیں اور فرض کر لیں کہ اجرتوں میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی تب بھی جو مالیت اور مال کی کثیر مقدار گردش میں ہے۔ مالیاتی لین دین میں جو زبردست سودے ہوتے ہیں، ان کی مجموعی رقم، یہ سب عموماً ہر روز بدلتا رہتا ہے؛ اور یہ کہ جو بینک نوٹ جاری کیے جاتے ہیں ان کی مقدار روزانہ بدلتی ہے؛ اور یہ کہ ان ادائیگیوں کی مقدار روزانہ بدلتی رہتی ہے جو نقد رقم کے بغیر وصول ہوتی ہیں اور بونڈ، قرضوں، چیکوں، بک کریڈٹوں، کلیرنگ ہاؤسوں کے واسطے سے کی جاتی ہیں؛ اور یہ کہ جہاں تک دھات کے چلتے ہوئے سکوں کی ضرورت ہے تو سکوں کی اس مقدار کا تناسب جو گردش میں رہتا ہے، سکوں اور سلاخوں کی اس مقدار سے جو محفوظ ذخیرے یا بینک

کے تہہ خانوں میں پڑی ہو، روزانہ بدلتا رہتا ہے؛ اور یہ کہ سونے کی وہ مقدار جو قوم کے ہاتھوں میں گھومتی رہتی ہے اور وہ مقدار جو سرحد پار بھیجی جاتی ہے تاکہ اسے بین الاقوامی گردش دی جائے، دونوں میں روزانہ فرق پڑتا رہتا ہے؛ انہیں پتہ چل جاتا کہ مجموعی رقم کے اٹل ہونے کا جو اٹل عقیدہ انہوں نے تراشا ہے، وہ ایک ہولناک گمراہی ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی سے کہیں میل نہیں کھاتی۔ بجائے اس کے کہ وہ کرنسی کے قانونوں سے اپنی بے خبری کو ایک دلیل بنا کر اجرت بڑھائے جانے کے خلاف استعمال کریں، ویسٹن صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ ان قوانین کا مطالعہ کریں جو کرنسی میں یہ لوچ پیدا کرتے ہیں کہ وہ اتنے لگاتار بدلتے ہوئے حالات کے مقابلے میں خود کو ڈھالتی چلی جاتی ہے۔

4۔ سپلائی اور مانگ

Supply and Demand

ہمارے دوست ویسٹن صاحب اس لاطینی کہاوت کو مانتے ہیں کہ:

repetitio est mater studirum یعنی دہرانا علم حاصل کرنے کی ماں ہے اسی لئے انہوں نے اپنے شروع کے اٹل عقیدے کو نئی شکل میں پھر سے دہرا دیا ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ اجرتوں کے بڑھنے کی وجہ سے جو کرنسی کی کمی پڑے گی وہ اپنی لپیٹ میں سرمائے کی کمی وغیرہ لے کر آئے گی۔ چونکہ میں زر کے بارے میں ان کی خیال آرائی کے متعلق پہلے ہی کہہ چکا ہوں اس لئے اب ان فرضی نتیجوں پر تفصیل سے بحث کرنا بالکل فضول ہوگا جو ویسٹن صاحب کے خیال میں کرنسی کے اس بھونچال سے ظاہر ہونے والے ہیں جو خود انہوں نے فرض کر رکھا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میں ان کے اس اٹل عقیدے کو طرح طرح سے دہرائے جانے کے باوجود جوں کا توں یعنی دوٹوک طریقے سے نظریاتی شکل میں کھول کر رکھ دوں۔

انھوں نے اپنے موضوع کے ساتھ کس قدر بے احتسابی برتی ہے، یہ صرف ایک ریمارک سے روشن ہو جائے گا۔ انہیں اجرتوں کے بڑھائے جانے پر اعتراض ہے۔ میں ان سے سوال کرتا ہوں، یہ بتایئے، اونچی اجرت اور نیچی اجرت کیا ہوتی ہے؟ مثلاً ایسا کیوں ہے کہ پانچ شلنگ فی ہفتہ تو نیچی اجرت ٹھہری اور بیس شلنگ فی ہفتہ اونچی اجرت؟ اگر پانچ شلنگ بیس شلنگ کے مقابلے میں کم اجرت ہے جو بیس شلنگ دو سو شلنگ فی ہفتہ کے سامنے اور بھی کم اجرت ہوئی۔ اگر کئی شخص تھرمامیٹر پر لکچر دیتے ہوئے صرف یہی کہتا رہے کہ پارہ اتنا اونچا چڑھ گیا، اتنا نیچے گر گیا تو اس سے کسی کو کچھ معلومات نہیں ملنے والی۔ سب سے پہلے اسے یہ بتانا چاہئے کہ اتنے ڈگری پر پانی جم جاتا ہے، اتنے پر ابلنے لگتا ہے، اور فطرت کے قانون نے یہ حدیں مقرر کر رکھی ہیں، یہ ان لوگوں کا ڈھکوسلا نہیں ہے جو تھرمامیٹر بیچتے یا بناتے ہیں۔ ویسٹن صاحب نے اجرت اور منافع کے بیان میں یہ کہیں نہیں بتایا کہ معاشی قانون سے ابتدا اور انتہا کے یہ نقطے قرار پاتے ہیں، بتایا کہ معاشی قانون سے ابتدا اور

انتہا کے یہ نقطے قرار پاتے ہیں، بتانا تو کیا، انھوں نے ان نقطوں کی تلاش کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی وہ اتنے میں ہی مطمئن ہو گئے کہ اونچے اور نیچے کے جو چلتے ہوئے بے حیثیت لفظ تھے انھی کو قبول کر لیا اور سمجھ لیا کہ بس ان میں ایک مقررہ اور قطعی مفہوم پوشیدہ ہے، اگر چہ یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ کسی ایک پیمانے سے ناپنے کے بعد، جس کے ذریعے کمی بیشی کا اندازہ کیا جائے اجرت کو چاہے اونچا کر لیجئے، چاہے نیچا۔

وہ مجھے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے کہ محنت کی ایک مقررہ مقدار کے بدلے میں ایک مقررہ رقم کیوں دی جاتی ہے۔ اگر وہ جواب دیں کہ سپلائی (رسد) اور ڈیمانڈ (طلب یا مانگ کے قانون سے یہ رقم طے پاتی ہے تو میں فوراً سوال کروں گا کہ پھر وہ کون سا قانون ہے جس کے ذریعے سپلائی اور ڈیمانڈ میں باقاعدگی پیدا ہوتی ہے؟ اسی انداز کا جواب انھیں بند گلی میں پہنچا دے گا۔ محنت کی سپلائی اور اس کی مانگ کے درمیان مستقل کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اس کمی بیشی کے ساتھ ساتھ محنت کا بازار بھاؤ بھی بدلتا رہتا ہے۔ اگر مانگ سپلائی سے بڑھ گئی تو اجرت بڑھ جاتی ہے اور اگر سپلائی مانگ سے اوپر گئی تو اجرت گر جاتی ہے، اگر چہ اس قسم کے حالات پیدا ہونے پر یہ ٹٹول کر دیکھنا بھی ضروری سمجھا جا سکتا ہے کہ واقعی سپلائی اور ڈیمانڈ کس رنگ میں ہیں مثلاً ہڑتال کے ذریعے یا کسی اور تدبیر سے یہ جانچ کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ سپلائی اور ڈیمانڈ کا قانون ہی اجرتوں کو ایک نہج پر رکھنے والا قانون ہے تو پھر اجرت بڑھنے کے خلاف آپ کا دعویٰ بچگانہ بھی ہے اور فضول بھی، کیوں کہ اس حاوی مطلق قانون کے مطابق جس کا آپ حوالہ دے رہے ہیں، وقت وقت سے اجرت کا بڑھنا بھی اتنا ہی لازمی اور قاعدے کی بات ہے جتنا وقتاً فوقتاً اجرت کا گرنا۔ لیکن اگر آپ سپلائی اور ڈیمانڈ کو اجرتوں کی باقاعدگی رکھنے والا قانون نہیں مانتے تو میں اپنا سوال پھر سے دہراتا ہوں: ایسا کیوں ہے کہ محنت کی ایک مقررہ مقدار کے بدلے ایک مقررہ رقم ادا کی جاتی ہے؟

مگر اس معاملے کو ذرا زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ دیکھیں: اگر آپ یہ تصور کر لیں کہ محنت کی قدر (ویلیو) یا کسی اور مال کی قدر بالآخر سپلائی اور مانگ سے ہی طے پاتی ہے تو آپ سراسر غلطی پر ہیں۔ سپلائی اور مانگ تو بازاری بھاؤ کی صرف وقتی اونچ نیچ کو چلاتی ہیں۔ ان کے ذریعے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ کسی مال کا بازار بھاؤ اس کی ویلیو سے اوپر کیوں جا رہا ہے یا اس سے نیچے کیوں اتر رہا ہے، لیکن سپلائی اور مانگ سے خود کسی مال کی ویلیو (قدر) کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ فرض کئے لیتے ہیں کہ سپلائی اور ڈیمانڈ آپس میں ایک دوسرے کا پلہ برابر رکھتے ہیں یا ماہرین معاشیات کے بقول وہ ایک دوسرے کو پورا کرتے ہیں۔ ٹھیک اس وقت جب یہ دونوں آمنے سامنے کی طاقتیں ایک دوسرے کے برابر تلتی ہیں، تو وہ ایک دوسرے کو ناکارہ کر دیتی ہیں اور کسی سمت میں بھی حرکت نہیں ہونے دیتیں۔ جب سپلائی اور ڈیمانڈ ہم پلہ ہو جائیں اور اس کے باعث اثر تاثیر چھوڑ دیں تو مال کے بازار بھاؤ اس کی اصل ویلیو (قدر) یا معمول کی قیمت سے میل کھاتے ہیں اور اسی کے آس پاس چکر لگا رہے رہتے

ہیں۔لہٰذا جب اس ویلیو کی نوعیت کا پتہ لگانے نکلیں تو ہمیں اس سے کوئی غرض نہ ہونی چاہیئے کہ سپلائی اور ڈیمانڈ کا بازار بھاؤ پر وقتی اثر کیا پڑتا ہے۔ یہ بات اجرت کے بارے میں بھی اتنی ہی درست ہے جتنی اور تمام قسموں کے مال کی قیمتوں پر صادق آتی ہے۔

ہمارے دوست کی تمام دلیلیں اگر ان کو نہایت سادہ نظریاتی لفظوں میں سمویا جائے تو لے دے کر اس ایک اذعانی عقیدے کے کلمے پر پہنچتی ہیں: "مال کی قیمتیں اجرتوں سے طے پاتی ہیں یا ان کے مطابق چڑھتی اترتی ہیں"۔

اس دقیانوسی اور ٹھکرائی ہوئی غلط بیانی کا توڑ کرنے کے لیے میں عملی تجربے کی مدد بھی لے سکتا ہوں اور یہ بھی کر سکتا ہوں کہ آپ کو یہ حقیقت جتادوں کہ انگریزی کارخانوں کے مزدور، کان کھودنے والے، جہاز بنانے والے مزدور وغیرہ یعنی وہ جن کی محنت کے اچھے دام اٹھتے ہیں، ان کے ہاتھوں جو سامان تیار ہو کر نکلتا ہے، وہ دوسری قوموں کے تیار کیے ہوئے ویسے ہی سامان کے مقابلے میں کچھ سستا بکتا ہے، حالانکہ اس کے سامنے انگریزی فارموں میں کام کرنے والوں کی محنت سے جو سامان تیار ہوتا ہے۔ اور یہ وہ ہیں جن کی محنت کم داموں پر جاتی ہے۔ وہ سامان قریب قریب تمام دوسری قوموں کے اسی سامان سے زیادہ مہنگا بکتا ہے۔ میں کسی ایک ملک کی بنی ہوئی کئی چیزوں کا مقابلہ کر کے یا کئی ملکوں کے مال کا موازنہ کر کے یہ دکھا سکتا ہوں کہ چند موقعوں کو چھوڑ کر جن میں اصلیت کے بجائے دکھاوا زیادہ ہے، باقی اوسط موقع ایسے ہیں کہ زیادہ دام پانے والی محنت سستا مل تیار کرتی ہے اور کم دام پانے والی مہنگا مال۔ اس سے دور دور یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ایک موقع پر محنت کی اونچی قیمت اور دوسرے موقع پر نیچی قیمت ہر بار ایک دوسرے کے بالکل الٹا نتیجہ پیدا کرتی ہیں، لیکن بہر حال ان سے یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ محنت کے داموں سے مال کی قیمتیں نہیں چکائی جاتیں۔ تاہم تجربے سے بات پیدا کرنے کا یہ طریقہ ہمارے لیے بالکل غیر ضروری ہے۔

ممکن ہے کسی کو اس سے انکار ہو کہ مسٹر ویسٹن نے اس عقیدے پر زور دیا ہے کہ "مال کی قیمتیں اجرتوں سے طے پاتی ہیں یا ان کے مطابق چڑھتی اترتی ہیں"۔ واقعی انہوں نے خود یہ فارمولا پیش نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برخلاف ان کا کہنا ہے کہ منافع اور کرایہ بھی مال کی قیمتوں میں شریک ہوتے ہیں کیونکہ مال کی قیمتوں سے ہی، محنت کرنے والوں کی اجرت کے علاوہ سرمایہ دار کا منافع اور زمین جائیداد والے کا کرایہ نکالا جاتا ہے۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ مسٹر ویسٹن کی رائے میں قیمتوں کا تعین کیسے ہوتا ہے؟ اول تو اجرتوں سے ہوتا ہے۔ پھر کچھ فیصدی سرمایہ دار کے منافع کے طور پر اور کچھ فیصدی زمین والے کا کرایہ ان قیمتوں میں جوڑ لیا جاتا ہے۔ فرض کیجیے کسی مال کی تیاری میں جو لیبر لگی ہے، اس کی اجرت دس کے برابر ہوئی ہے، منافع کی شرح اگر اجرت کے ہم پلہ سو فیصدی رکھی جائے تو سرمایہ دار مال کی قیمت میں دس اور بڑھا دے گا اور اسی نسبت سے اگر کرایہ زمین وغیرہ اجرت کا سو فیصدی ہو تو دس اور بڑھایا جائے گا، یعنی مال کی قیمت تیس ہوگئی۔ قیمتوں کا یہ جو تعین ہوا یہ سید

ھا سیدھا اجرتوں کے حساب سے قرار پایا ہے۔ اگر اد ہر کی مثال میں اجرت دس کے بجائے بیس کو پہنچ جائے تو مال کی قیمت بھی تیس سے ساٹھ ہو جائے گی۔ یہی نسبت آگے چلے گی۔ چنانچہ سیاسی معاشیات پر اگلے وقتوں کے جتنے لکھنے والے گز رے ہیں، جنہوں نے یہ اندھا اعتقاد پھیلایا کہ اجرتیں ہی قیمتوں کی کمی بیشی طے کرتی ہیں، وہ ثبوت میں ہمیشہ یہی کوشش کر تے رہے کہ منافع اور کرائے کو اجرتوں پر فیصدی اضافہ سمجھ کر جوڑ دیا جائے۔ لیکن ان میں سے کسی کے بس کی بات نہ تھی کہ اس فیصدی اضافے کی حدود کو کسی معاشی قانون یا اصول کا پابند کر کے دکھائیں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انہوں نے دل میں سوچ رکھا ہے کہ منافع کا سوال پرانے دستور یا چلن سے، سرمایہ دار کی مرضی سے یا کسی ایسے ہی یک طرفہ اور انجانے طر یقے سے طے پاتا ہے۔ اگر وہ اس پر زور دیں کہ منافعے طے پاتے ہیں سرمایہ داروں کے درمیان مقابلے سے تو یہ کوئی بات نہ ہوئی۔ مقابلہ ہوگا تو مختلف کاروباروں میں منافع کی اونچ نیچ اپنا پلہ برابر کر لے گی یعنی منافع کی مختلف شرحوں کو کسی اوسط پر لے آئے گی، لیکن وہ لیول کیا ہونا چاہیے، یا منافع کی عام شرح کتنی ہو، یہ کبھی طے نہ کر سکے گی۔

جب ہم کہتے ہیں کہ مال کی قیمتیں اجرتوں سے طے پاتی ہیں تو ہم کہنا کیا چاہتے ہیں؟ خود اجرت کیا ہے؟ محنت کی قیمت۔ تو مطلب یہ ہوا کہ مال کی قیمتیں محنت کی قیمت سے طے پاتی ہیں مگر چونکہ "قیمت" تبادلہ ہے (جب بھی میں قدر (ویلیو) کا نام لیتا ہوں، میرا مطلب ہوتا ہے اس ویلیو سے جس پر مالوں کا تبادلہ کیا جائے) تو قیمت وہ ویلیو ہوئی جو نقدی کی صورت میں ظاہر ہو۔ بیان کا خلاصہ یہ نکلا کہ ''مالوں کی قدر (ویلیو) محنت کی ویلیو سے طے پاتی ہے،، یا یوں کہیں کہ ''محنت کی ویلیو ہی ایک عام پیمانہ ہے جس سے اور قدریں ناپی جاتی ہیں"۔

تو پھر خود ''محنت کی ویلیو،، کیوں کر طے پاتی ہے؟ آگے راستہ بند ہے۔ اگر ہم منطق کی معقولیت سے بحث کریں تو واقعی راستہ بند ہے۔ لیکن جو لوگ اوپر کے عقیدے کے قائل ہیں انہیں منطقی معقولیت سے کیا سروکار۔ ہمارے دوست ویسٹن صا حب کی مثال لیجئے۔ پہلے تو انہوں نے ہمیں بتایا کہ مال کی قیمتیں اجرتوں سے طے پاتی ہیں، لہٰذا اجرت بڑھنے سے قیمت بھی ضرور بڑھے گی۔ پھر انہوں نے ایک چکر اور کاٹا اور ہمیں جتایا کہ اجرتوں کے بڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ سامان کی قیمتیں بھی بڑھ چکی ہوں گی اور حقیقت میں اجرتوں کا ناپ ہے اس سامان کی قیمتوں سے جس پر یہ اجرتیں خرچ کی جاتی ہیں۔ تو اب ہم یہ کہتے کہتے کہ محنت کی ویلیو مالوں (یا سامان) کی ویلیو کا فیصلہ کرتی ہے، یہ کہنے پر اتر آتے ہیں کہ مالوں کی ویلیو محنت کی ویلیو کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس طرح ہم آگے پیچھے چکر کاٹتے رہ جاتے ہیں اور نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا۔

لے دے کے ظاہر یہ ہوا کہ اگر ہم کسی ایک مال کی ویلیو کو چاہے وہ محنت کی ویلیو ہو، اناج کی ہو یا کسی اور مال کی، باقی تمام قدروں کا ناپ اور انہیں چلانے والا مان لیتے ہیں تو ہم مشکل کا بوجھ صرف ٹال رہے ہیں کیونکہ ایک ویلیو جو خود اپنا تعین چا ہتی ہے، ہم اس کا تعین دوسری ویلیو سے کیے دے رہے ہیں۔ یہ اندھا اعتقاد کہ "اجرتیں ہی مالوں کی قیمتیں طے کرتی

ہیں "اگر مطلق طریقے سے رکھ دیا جائے تو اس نوبت کو پہنچا دیتا ہے کہ "ویلیو طے پاتی ہے ویلیو سے "اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ویلیو کے بارے میں دراصل کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ اگر اس قیاس کو بنیاد مان لیا جائے تو سیاسی معاشیات کے عام اصولوں کے بارے میں سارا بحث استدلال تو تلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ماہر معاشیات ریکارڈو کا زبردست کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی 1817 میں شائع شدہ تصنیف "سیاسی معاشیات کے اصول" میں اس پرانے، بوسیدہ، مقبول عام مفروضے کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیا کہ "اجرتیں ہی قیمتوں کا فیصلہ کرتی ہیں"۔ یہ ایک ایسا مفروضہ تھا جسے آدم اسمتھ اور اس کے فرانسیسی پیشرو اپنی معاشی تحقیقات کے اصل علمی حصوں میں تو رد کر چکے تھے لیکن پھر بھی انہوں نے ہلکے پھلکے اور گھٹیا قسم کے بابوں میں اسی کو پھر دہرا دیا تھا۔

قدر اور محنت

Value and Labour

صاحبان اب میں اس نکتے پر آ گیا ہوں جہاں سوال زیر بحث کو قطعی طور پر صاف کرنا ضروری ہے۔ میں یہ وعدہ نہیں کرتا کہ آپ کی پوری تسلی کر سکوں گا کیونکہ اس کے لئے تو سیاسی معاشیات کا پورا میدان چھاننا پڑے گا۔ البتہ اتنا ہے کہ بقول فرانسیسیوں کے effleurer la question یعنی بنیادی نکتوں کو چھوتا ہوا گذروں گا۔

پہلا سوال ہمیں یہ اٹھان ہوگا: کسی مال کی ویلیو (قدر) کیا ہوتی ہے؟ اور کیسے طے پاتی ہے؟

پہلی نظر میں پتہ چل جاتا ہے کہ کسی مال کی ویلیو ایک اضافی یا نسبتی چیز ہے اور وہ طے نہیں پاتی جب تک کہ ایک مال کو دوسرے مالوں کی نسبت سے نہ تولا جائے۔ حقیقت میں جب ہم ویلیو کا لفظ زبان سے نکالتے ہیں، یعنی مال کے بدلے میں جو ویلیو ملتی ہے، وہ کہتے وقت ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تبادلے میں جو دوسرے مال ملیں گے ان کی مقداروں کی نسبت اتنی ہوگی۔ تب سوال یہ ہوگا کہ جن نسبتوں میں مالوں کا ایک دوسرے سے تبادلہ ہوتا ہے وہ نسبتیں کم وبیش کیوں کر ہوتی رہتی ہیں۔

تجربے نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ یہ نسبتیں برابر ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔ صرف کسی ایک مال کو لے لیجئے۔ مثال کے طور پر گیہوں کی ایک بوری کو دوسرے مختلف مالوں کے بے شمار تناسب سے بدلا جا سکتا ہے۔ پھر بھی اس کی ویلیو جوں کی توں رہتی ہے، چاہے ہم اسے ریشم سے بدلیں، سونے سے یا کسی اور مال سے، مگر وہ جو ویلیو ہے وہ مختلف چیزوں کے ساتھ تبادلے کی شرح بدلتے رہنے کے باوجود الگ اپنا کوئی وجود رکھتی ہے۔ مختلف مالوں سے تبادلے میں جو طرح طرح کی نسبتیں بنتی

ہیں ان سے ہٹ کر بھی کسی الگ صورت میں ویلیو کو ظاہر کرنے کا امکان تلاش کرنا چاہئے۔

آگے چلئے: اگر میں کہوں کہ گیہوں کی ایک بوری لوہے کی ایک خاص مقدار سے بدلی جاتی ہے یا گیہوں کی ایک بوری کے ویلیو لوہے کی اتنی مقدار میں ظاہر ہوتی ہے یا گیہوں کی ایک بوری کی ویلیو لوہے کی اتنی مقدا میں ظاہر ہوتی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ گیہوں کی ویلیو اور اس کے مساوی لوہے کی ویلیو برابر ہیں کسی تیسری چیز کے، جو نہ گیہوں ہے نہ لوہا، کیونکہ میرے ذہن میں ان دونوں کی ایک خاص مقدار دو مختلف صورتوں میں آئی ہے۔ چنانچہ گیہوں یا لوہا، لدونوں میں سے کوئی بھی مال ایک دوسرے سے قطعی بے تعلق رہ کر اس تیسری چیز کے مساوی ہوگا جس میں ان دونوں کا مشترکہ ناپ موجود ہے۔

اسی نکتے کو اور واضح کرنے کے لئے میں سیدھی اقلیدسی شکل لیتا ہوں۔ مثلثوں کی جتنی بھی شکلیں بن سکتی ہیں اور جتنے بھی چھوٹے بڑے مثلث بنائے جاسکتے ہیں ان کے رقبے کا موازنہ کرنے میں، یا مثلثوں کا مستطیل کے رقبے سے یا زاویہ قائمہ کی کسی اور شکل کے رقبے سے موازنہ کرنے میں ہمیں کیا کرنا ہوتا ہے؟ ہم کسی بھی مثلث کو لے کر اس کا رقبہ ایسی صورت میں نکال لیتے ہیں جو اس مثلث کی ظاہراً شکل سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔ خود مثلث کی بناوٹ سی ہی ہم نے یہ اصول بنالیا ہے کہ بنیاد کو بلندی سے ضرب دے کر جو حاصل ضرب ہوگا، مثلث کا پورا رقبہ اس سے آدھا ہوگا۔ اب ہم اس رقبے کو ہر قسم کے مثلثوں اور طرح طرح کی شکلوں کے مستطیلوں کے مختلف رقبوں سے ملا کر دیکھ سکتے ہیں کیونکہ ان کے جتنے بھی رقبے نکلیں گے وہ سب مثلثوں کی کسی نہ کسی تعداد کے رقبے کے برابر ہی پہنچیں گے۔

مختلف مالوں کی ویلیو نکالنے میں بھی حساب کا یہی قاعدہ اپنایا جاسکتا ہے۔ ہمیں ان سب کی قدروں کو کسی ایسی صورت میں ڈھالنا چاہیے جو سب میں مشترک ہو البتہ وہ خاص ناپ ان مالوں میں جتنا کم یا زیادہ ہو اسی نسبت سے وہ ایک دوسرے سے الگ پہچانے جائیں۔

چونکہ مالوں کے اندر مبادلے کی قدریں صرف ان چیزوں کی سماجی کارگزاری میں ہی ہوتی ہیں اور ان چیزوں کی قدرتی خاصیتوں سے ویلیو کو کچھ واسطہ نہیں ہوتا اس لیے ہمارا پہلا سوال یہ ہوگا کہ مالوں کے اندر وہ کون سا سماجی جوہر ہے جو سب میں مشترک ہو؟ وہ ہے لیبر (محنت)۔ کسی مال کو تیار کرنے میں محنت کی خاصی مقدار یا تو اس پر لگانی پڑتی ہے یا اس میں کھپی ہوتی ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ محض محنت کی نہیں بلکہ سماجی محنت کی خاص مقدار۔ جب کوئی شخص ایک چیز فوری ضرورت کے لیے، ذاتی استعمال کے لیے تیار کرتا ہے تو وہ ایک تیار چیز ہوئی، تیار مال نہیں ہوا۔ اس شخص نے اپنا کام چلانے کو ایک چیز تیار کی تو اسے سماج سے کچھ سروکار نہیں۔ لیکن مال تیار کرنے میں ہوتا یہ ہے کہ آدمی صرف وہی چیز نہیں بناتا جو کسی سماجی ضرورت کی تسکین کردے بلکہ خود اس کی محنت بھی اس مجموعی مقدار محنت کا ایک لازمی حصہ ہوتی ہے جو سماج نے چیزوں کے بنانے پر خرچ کی ہے ہر آدمی کی محنت اس محنت کی تقسیم کی پابند ہے جو سماج کے اندر جاری ہوتی ہے۔ سماجی محنت کی دوسری کڑ

یوں سے الگ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ انہی کو جوڑنے اوران کا حصہ بننے میں یہ ذاتی محنت کام آتی ہے۔

جب ہم مالوں کوقدریں شمار کرتے ہیں تو ہماری نظر میں ان کا صرف ایک ہی پہلو ہوتا ہے کہ وہ حاصل کی ہوئی، سمٹی ہوئی، اورآپ چاہیں تو یوں کہئے کہ ٹھوس شکل میں سمائی ہوئی سماجی محنت ہیں۔ اس حیثیت سے ان میں اگر کوئی فرق ہے تو اس بات کا کہ محنت کی کم مقدار لگی ہے یا زیادہ۔ مثلاً ایک ریشمی رومال تیار کرنے میں محنت کی زیادہ مقدار لگی ہوگی اور اینٹ تیار کرنے میں کم۔ سوال کہ ہے کہ محنت کی مقدار کیسے ناپی جائے؟

ناپ ہوگا جتنی دیر محنت کی گئی وہ وقت۔ گھنٹوں اور دنوں وغیرہ کے حساب سے محنت ناپی جائے گی۔ اوراس ناپ سے کام لے کر ہم سب طرح کی محنتوں کا ایک اوسط یا معمولی محنت کی سطح پر لاکران کیا کائی معلوم کرلیں گے۔

چنانچہ اب ہم اس نتیجے پر: مال میں ایک ویلیو ہوتی ہے، وجہ یہ کہ سماجی محنت کا ایک ٹھوس شکل اختیار کرنا ہی مال ہے۔ اس کی ویلیو سائز یا نسبتی ویلیو کتنی بڑی ہے، یہ بات منحصر ہے اس پر کہ جو سماجی جوہر اس مال میں موجود ہے وہ زیادہ ہے یا کم۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ اس مال کی تیاری میں جو مجموعی محنت صرف ہونی لازم ہے اس کی نسبتی کمی بیشی پر ویلیو کا سائز منحصر ہوتا ہے۔ مختلف مالوں کی قدروں کا باہم کم وبیش ہونا اس سے طے پاتا ہے کہ ان میں محنت کی کتنی کتنی مقدار لگ چکی ہے، کھپی ہوئی ہے، یا جمع ہے۔ محنت کے یکساں وقت میں جو مال بنتے ہیں ان کی مالیت بھی یکساں ہوتی ہے۔ یا یوں کہیں کہ ایک مال کی ویلیو دوسرے مال کی ویلیو سے وہی نسبت رکھتی ہے جو نسبت ایک مال میں لگی ہوئی محنت اور دوسرے مال میں لگی ہوئی محنت کے درمیان ہوتی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ میں سے اکثر لوگ سوال کر بیٹھیں گے کہ مال کی قدریں اجرت سے طے پانے میں یا محنت کی جتنی مقدار اس مال کی تیاری میں لگنی ضروری ہے، اس مقدار کی نسبت سے طے پانے میں کیا واقعی اتنا بڑا یا کچھ بھی فرق پڑتا ہے؟ آپ یہ تو ضرور نا نتے ہیں کہ محنت کا انعام اور محنت کی مقدار، یہ دونوں بالکل الگ چیز ہیں۔ آیئے، فرض کریں کہ ایک بوری گیہوں میں اور ایک اونس سونے میں برابر کی محنت لگی ہوئی ہے۔ میں نے یہ مثال اس لئے اختیار کی کہ بنجامن فرینکلن نے 1729 میں شائع شدہ اپنے پہلے مضمون میں یہی مثال لی تھی۔ مضمون کا عنوان تھا" کاغذی کرنسی کی فطرت اور ضرورت کے بارے میں ایک ہلکی سی تحقیق"۔ ویلیو کی اصلیت ٹٹولنے کی یہ بھی ایک اولین کوشش تھی۔ خیر تو ہم فرض کر لیتے ہیں کہ گیہوں کی ایک بوری اور ایک اونس سونے میں برابر کی ویلیو ہے یا قدر میں دونوں مساوی ہیں کیوں کہ دونوں میں اوسط درنے کی محنت کی ایک سی مقدار ٹھوس شکل اختیار کئے ہوئے ہے، اتنے دن یا اتنے ہفتے کی محنت ان کے اندر اکٹھی ہوگئی ہے۔ اس طرح سے جب ہم سونے اور اناج کی نسبتی قدریں طے کرے ہیں تو کیا کہیں ان اجرتوں کا حوالہ بھی آتا ہے جو زراعت کے محنتی کو یا کان کھودنے والے کو دی گئی ہے؟ قطعی نہیں۔ ہم اس کے بارے میں کوئی سوال ہی نہیں کرنے کہ ان دونوں کی روزانہ یا ہفتہ واری محنت کیونکر ادا کی گئی بلکہ یہ وال تک درمیان میں نہیں آتا کہ ان مالوں میں

اجرتی محنت گیہوں کی ایک بوری میں لگی ہے، ممکن ہے اسے اجرت میں صرف اناج کے دو تھیلے ملے ہوں، اور جس نے کان پر کام کیا اسے سونے کا آدھا اونس مل گیا ہو۔ یا فرض کیجئے کہ ان کی اجرتیں برابر تھیں، تب بھی ممکن ہے کہ جو مال انہوں نے تیار کئے ہیں ان کی قدروں سے اجرتوں کا تناسب انتہائی مختلف رہا ہو۔ مال کی قدروں کے سامنے وہ آدھا ہو۔، تہائی، چوتھائی یا پانچواں حصہ ہو، ایک بوری اناج اور ایک اونس سونے کا کوئی سا حصہ ہوسکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جو مال انھوں نے تیار کیا ہے اس کی ویلیو کی حد سے اجرت بڑھ نہیں سکتی، زیادہ نہیں ہوسکتی، لیکن کم ہونے کو وہ کتنی بھی کم ہوسکتی ہے۔ تیار شدہ مال کی قدروں نے ان کی اجرتوں کی حد مقرر کر رکھی ہے لیکن اجرتوں نے تیار شدہ مال کی قدروں پر حد نہیں لگائی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مثال میں اناج اور سونے کی قدریں، نسبتی قدریں، لگی ہوئی محنت کی ویلیو یعنی اجرت شمار کئے بغیر ہی طے ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا مالوں میں جتنی جتنی مقدار لیبر کی لگی ہوئی ہے، اسی نسبت سے مالوں کی قدریں طے پانا قطعی اور بات ہے، اور یہ طریقہ کہ محنت کی ویلیو یعنی اجرت کی نسبت سے مالوں کی قدریں طے پانا بالکل دوسری چیز ہے۔ آگے کی چھان بین میں یہ نکتہ اور بھی واضح ہو جائے گا۔

کسی مال کی قدر مبادلہ (اکس چینج ایبل ویلیو exchangeable value) نکالتے وقت ہمیں چاہئے کہ پیداوار کے آخری مرحلے پر محنت کی جتنی مقدار لگی ہے اسی میں پہلے کی لگی ہوئی محنت کی مقدار بھی جوڑ لیں۔ یعنی اتنی محنت جو اس کے کچے مال پر خرچ ہو چکی ہے، اوزار، کل پرزے، مشین اور بلڈنگ پر لگ چکی ہے، جس سے بعد کی محنت کو مدد ملی۔ مثال کے طور پر سوتی دھاگے کی کسی ایک مقدار کی ویلیو معلوم کرنے کے لئے روئی کی کتائی ہوتے وقت لگی ہوئی محنت کی مقدار کو محنت کی اس مقدار کے ساتھ جوڑیں جو خود روئی تیار ہونے میں لگ چکی ہے۔ اور اسی میں محنت کی وہ مقدار بھی جو کوئلے، تیل اور دوسرے استعمالی مسالوں میں کھپی ہوئی ہے، پھر وہ مقدار جو بھاپ کے انجن میں، تکلیوں اور سانچوں میں، فیکٹری کی عمارت میں کھپی ہوئی ہے، یہ سب یکجا کی جائیں گی۔ وہ جو بجا طور پر پیداوار کے اوزار کہلاتے ہیں، جیسے اوزار، مشین، عمارتیں پیداوار کے مسلسل عمل میں تھوڑے یا بہت عرصے کے لئے برابر کام دیے جاتے ہیں۔ اگر وہ بھی کچے مال ہی کی طرح ایک دم استعمال میں آکر تمام ہو جائیں تو ان کی بھی تمام ویلیو ان مالوں پر ڈال دی جائے گی جنھیں تیار کرنے میں وہ کام آتے ہیں۔ مگر چوں کہ ان کا مصرف رفتہ رفتہ ہوتا ہے، جیسے سوتی مل کا سانچہ دیر تک چلتا ہے تو اس کا بھی کارکردگی کی مدت کے حساب سے ایک اوسط نکالا جاتا ہے اور اس حساب سے کسی مقررہ مدت مثلاً ایک دن کی گھسائی اور ٹوٹ پھوٹ کا اوسط نکل آتا ہے۔ اس طرح ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک سانچے کی پوری ویلیو کا کتنا حصہ ایک دن کی کتائی میں نکل جاتا ہے اور اسی طرح یہ بھی کہ ایک پونڈ دھاگے کے اندر محنت کی جو کل مقدار لگی ہوئی ہے اس میں محنت کی کتنی مقدار پہلے سے خرچ ہو کر ایک سانچے کے حصے میں آچکی تھی۔ جو مقصد فی الحال پیش نظر ہے، اس کا تقاضا ہے کہ زیر بحث نکتے کو زیادہ نہ پھیلائیں۔

ممکن ہے یوں نظر آئے کہ اگر کسی مال کی ویلیو محنت کی اس مقدار سے ہی طے ہونی ٹھہری جو مال کی تیاری میں کھپ گئی ہے تو پھر آدمی جتنا سست یا کام چور ہوگا اس کے مال کی ویلیو بی اتنی ہی بڑھ جائے گی کیوں کہ مال پر اپنا کام پورا کرنے میں وہ محنت کا اور بھی زیادہ وقت لگائے گا۔نہیں، یہ افسوسناک غلط فہمی ہوگی۔ یاد کیجئے کہ میں نے "سماجی محنت" کا لفظ استعمال کیا تھا۔اس ایک "سماجی" کی شرط میں کئی نکتے پوشیدہ ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ کسی مال کی ویلیو محنت کی اس مقدار سے طے پاتی ہے جو اس پر لگائی گئی یا اس میں ٹھوس طریقے سے موجود ہے تو ہمارا مطلب ہے کہ محنت کی وہ مقدار جو اس مال کی تیاری کے لئے لازم ہے، سماج کی ایک خاص حالت میں، پیداوار کے جو اوسط سماجی حالات ہیں ان میں، کام کی رفتار کا جو سماجی اوسط ہے اور لیبر کی ہنرمندی یا قابلیت کے اوسط درجے میں۔ انگلینڈ میں جب پاور لوم نے ہینڈ لوم (کھڈی کی بنائی) سے مقابلہ شروع کیا تو دھاگے کی مقررہ مقدار کو ایک گز سوت یا ایک گز کپڑا بنانے کے لئے پہلے سے صرف آدھا وقت محنت کافی ہونے لگا۔ ہاتھ کے بنکر غریب جو پہلے نو دس گھنٹے روزانہ کام کیا کرتے تھے، اب انہیں روز سترہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنا پڑ گیا۔ پھر بھی جتنا مال وہ بیس گھنٹے کی محنت سے تیار کرتے تھے وہ سماجی وقت محنت کے دس گھنٹے کے برابر رہا، یا یوں کہئے کہ دھاگے کی مقررہ مقدار کو سوتی کپڑا بنانے میں دس گھنٹے کی محنت سماجی طور پر لازم رہ گئی۔ چنانچہ اب بیس گھنٹے میں جو مال ہاتھ کے بنکر نے تیار کیا اس کی ویلیو اتنی ہی رہ گئی جتنی پہلے دس گھنٹے میں تیار کئے ہوئے مال کی ہوا کرتی تھی۔

غرضکہ تیار ہونے والے مال میں جو سماجی طور سے لازمی محنت لگی ہوئی ہے، اس محنت کی مقدار سے ہی مال کی قدر مبادلہ طے پاتی ہے تو اس مال کی تیاری کی خاطر محنت کی محنت کی مقدار جتنی بڑھے گی، وہ مال کی ویلیو بھی بڑھا دے گی اور محنت کی مقدار جتنی گھٹے گی، مال کی ویلیو بھی اتنی ہی گھٹا دے گی۔

الگ الگ مالوں کی تیاری کے لئے جتنی محنت ضروری ہے اگر اس کی الگ الگ مقدار ایک حال پر قائم رہتی ہے تو ان کی نسبتی قدروں کو بھی قائم رہنا چاہئے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ کسی مال کی تیاری کے لئے محنت کی جو مقدار لازم ہوتی ہے وہ برابر بدلتی رہتی ہے اس لیبر کی پیداواری طاقت کے فرق کے ساتھ جس سے کام لیا گیا ہے۔ لیبر کی پیداواری طاقت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی زیادہ مال ایک مقررہ وقت محنت میں بن کر تیار ہوگا۔ اور اسی طرح لیبر کی پیداواری طاقت جتنی کم ہوگی، اتنا ہی کم مال اسی وقت محنت میں بن کر تیار ہو سکے گا۔ مثال کے طور پر اگر آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ کمزور زمینوں پر کاشت کرنا ضروری ہو جائے تو پیداوار کی وہی پہلے کی سی مقدار حاصل کرنے کے لئے محنت کی زیادہ مقدار خرچ کرنی پڑے گی، نتیجہ یہ کہ زرعی پیداوار کی ویلیو برابر بڑھتی جائیگی۔ اب دوسری طرف سے دیکھئے کہ اگر پیداوار کے جدید ذریعوں سے کام لے کر کوئی ایک بنکر کپاس کی مقدار کو جس کام کے ایک دن کے دوران چرخی کا تا کرتی تھی، اتنی ہی وقت میں اس سے کئی ہزار گنا دھاگا بنا کر رکھ دیتا ہے تو یہ ظاہر بات ہے کہ کپاس کا ہر ایک پونڈ پہلے کے مقابلے میں کتائی کی محنت ہزاروں گنی کم جذب کریگا۔ نتیجہ

یہ کہ کپاس کے ایک ایک پونڈ میں کتائی سے جو ویلیو بڑھ جایا کرتی تھی، وہ پہلے سے ہزاروں گنا کم ہو جائے گی اور اسی حساب سے دھاگے کی ویلیو بھی بہت نیچے جائے گی۔

مختلف لوگوں کی قدرتی صلاحیت، طاقت اور کام کرنے کے خاص اکتسابی تجربے کا جو فرق ہوتا ہے، اس سے قطع نظر لیبر کی پیداواری طاقت خاص طور سے ان باتوں پر منحصر ہے:

اول، تو محنت کے قدرتی حالات پر، مثلاً زمین کی زرخیزی، کانوں وغیرہ کی حالت پر؛

دوسرے، لیبر کی سماجی طاقت کی رفتہ رفتہ بہتری پر۔ ایسی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں تب جب بڑے پیمانے پر مال تیار کیا جائے، بڑا سرمایہ لگا ہوا اور لیبر بہت اکٹھی ہو چکی ہو، محنت کی تقسیم در تقسیم چلی گئی ہو، مشینری، ترقی یافتہ طریقے، کیمیکل اور دوسری قدرتی صلاحیتوں کا استعمال ہو، رسل و رسائل اور سامان لانے لے جانے کی سہولت کے ذریعے وقت اور جگہ کی بچت کی گئی ہو، اور بھی مختلف ایجادوں سے جن کے ذریعے سائنس قدرتی صلاحیتوں کو انسانی محنت کی خدمت میں لگا دیتی ہے اور جن کی بدولت لیبر کا سماجی یا مل کر کام کرنے والا کردار ابھر آتا ہے۔ لیبر کی پیداواری طاقتیں جتنی بڑھتی جائیں گی سامان کی ایک مقدار تیار کرنے میں اتنی ہی کم محنت کھپے گی اور اس کے باعث مال کی ویلیو بھی اور گھٹ جائے گی اور لیبر کی طاقت جتنی کم ہو گی سامان کی پہلے والی مقدار تیار کرنے میں اتنی ہی زیادہ محنت کھپے گی۔ پس اس کی ویلیو بھی اور بڑھ جائے گی۔ اب ایک کلیے کی شکل میں ہم اسے یوں رکھتے ہیں کہ: مالوں کی قدریں سیدھے سیدھے محنت کے اس وقت سے مناسبت رکھتی ہیں جو اس سامان کی تیاری میں لگا ہے، اور دوسری سمت میں وہ لگی ہوئی محنت کی پیداواری طاقت سے الٹی مناسبت رکھتی ہیں

۔

اب تک ساری گفتگو ویلیو (قدر) پر ہوتی رہی، اب کچھ قیمت کے بارے میں بھی کہتا چلوں۔ قیمت ہی ایک نرالا روپ ہے ویلیو کا۔

قیمت بجائے خود کچھ نہیں، سوائے اس کے کہ نقدی کی صورت میں ظاہر ہونے والی ویلیو ہے۔ مثلاً یہاں، انگلینڈ میں جتنے مال بن کر نکلتے ہیں ان کی ویلیو سونے کی قیمتوں میں ظاہر کی جاتی ہے اور براعظم یورپ کے سارے مالوں کی قدریں چاندی کی قیمتوں میں۔ دوسرے مالوں کی طرح خود سونے چاندی کی قیمتیں بھی محنت کی اس مقدار کی پابند ہیں جو ان دونوں دھاتوں کے حاصل کرنے میں کھپنی ضروری ہے۔ آپ اپنی قومی پیداوار کی ایک خاص مقدار جس میں آپ کی قومی محنت کی ایک خاص مقدار ٹھوس شکل میں موجود ہے سونا اور چاندی پیدا کرنے والے ملکوں کے ہاتھ بدلتے ہیں اور ان ملکوں کا سامان لیتے ہیں جس میں ان ملکوں کی محنت کی بھی ایک خاص مقدار ٹھوس شکل میں موجود ہے۔ اس طرح مال کی ادلا بدلی سے آپ سونے اور چاندی کی صورت میں تمام مالوں کی قدریں ظاہر کرنے لگتے ہیں یعنی جتنی جتنی محنت ان پر لگ چکی ہے اس کا اظہار سونے

، چاندی میں کرتے ہیں۔ ویلیو کا نقدی میں جو اظہار ہوتا ہے یا اسی کو یوں کہہ لیجئے کہ ویلیو جو قیمت کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے، اس کو اگر اور گہرائی تک دیکھئے تو یہ کھلے گا کہ ایک سلسلہ وار عمل ہے جس کے ذریعے آپ تمام مالوں کی قدروں کو الگ سے اور ایک سا روپ دے دیتے ہیں یا جس کے ذریعے آپ یوں کرتے ہیں کہ برابر کی سماجی محنت کی مقداروں میں تمام مالو ں کی ویلیو ظاہر ہو جائے۔ قیمت کی یہ جو حیثیت ہے کہ وہ نقدی کے روپ میں ظاہر ہونے والی ویلیو ہی ہوتی ہے۔ تو اس کا نام آدم اسمتھ نے نیچرل پرائس رکھا ہے اور فرانسیسی Physiocrats (21) نے اسے "لازمی قیمت" (Prix necessairs) کہا ہے۔

اچھا تو ویلیو اور بازار کی قیمتوں میں یا یوں کہیں کہ قدرتی قیمتوں اور بازار کے داموں میں کیا نسبت ہے؟ آپ سب کو معلوم ہے کہ کسی ایک قسم کے تمام مالوں کے بازار دام ایک ہی ہوتے ہیں، چاہے مال تیار کرنے والوں کے اپنے حالات میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو۔ بازار دام سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ایک چیز کی کوئی خاص مقدار بازار میں لانے کے لیے، اس کے پیداوار کے اوسط حالات میں سماجی محنت کی کتنی اوسط مقدار لازم ہوتی ہے۔ کسی ایک خاص قسم کے مال کی پوری کھیپ پر بازار دام کا حساب پھیلایا جاتا ہے۔ یہاں تک تو بازار دام مال کی ویلیو سے میل کھاتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف باز ار میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے، کبھی قدرتی قیمت یا ویلیو سے بازار اوپر گیا، کبھی نیچے اتر گیا، یہ منحصر ہے مانگ اور سپلائی کے اتار چڑھاؤ پر۔ بازار کے داموں کا پلہ ویلیو کے برابر نہ ٹھیرنا مستقل نظر آتا ہے، لیکن جیسا کہ آدم اسمتھ نے کہا ہے، بات یوں ہے کہ:

"نیچرل قیمت ہی وہ بیچ کی قیمت ہے جس کی طرف تمام مالوں کی قیمتیں ہر پھر کر آتی رہتی ہیں۔ اتفاقی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو قیمتوں کو کبھی اچھا خاصا اوپر لے جا کر تھامے رہتے ہیں اور کبھی اتنی نیچے اترنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ لیکن بیچ کی اس پکی قیمت سے ہٹانے والی چاہے کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ آتی رہیں۔ تاہم بار بار قیمت اسی درمیانی نقطے پر آ کر ٹھیرنا چاہتی ہے۔"(22)

میں فی الحال اس سوال کی زیادہ چھان بین نہیں کرتا۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگر مانگ اور سپلائی میں توازن بنا رہے تو ما لوں کے بازار دام ان کی نیچرل قیمتوں سے تال میل رکھتے ہیں، یعنی اس ویلیو سے مناسبت رکھتے ہیں جو کسی مال کی تیاری میں لگنے والی محنت کی مقدار سے ہی طے پاتی ہے۔ مگر سپلائی اور مانگ کو مستقل ایک دوسرے کا پلہ برابر رکھنے میں لگا رہنا چا ہیے، حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ کبھی ایک اور دوسرا پلہ بھاری کر کے، یعنی کبھی تیزی کو مندی سے اور کبھی اس کے برعکس کر کے وہ کمی پیشی کا حساب برابر کر لیتے ہیں۔ اگر ایک دن کی تیزی مندی کو نظر میں رکھنے کے بجائے آپ زیادہ عرصے تک بازار کے دامو ں کی رفتار کا تجزیہ کریں جیسا کہ مسٹر ٹوک نے اپنی تصنیف "قیمتوں کی تاریخ" میں کیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ بازار کے دا

موں کا چڑھنا اترنا، ویلیو سے ہٹا رہنا، تیزی اور مندی ایک دوسرے کا اثر زائل کرتی اور باہم تلافی کر لیتی ہے۔ سوائے اس کے کہ اجارہ داری اور بعض دوسری وجہیں جو اثر انداز ہوا کرتی ہیں، ان سے قطع نظر کرتے ہوئے مجھے اتنا کہنا ہے کہ مالوں کی جتنی قسمیں ہوتی ہیں وہ سب کی سب اوسط میں اپنی قدروں یا نیچرل قیمتوں پر ہی فروخت کی جاتی ہیں۔ اوسط مدت جس کے اندر بازار دام اونچ نیچ کے ذریعے اپنا حساب برابر کر لیتے ہیں، مال کی مختلف قسموں کے معاملے میں مختلف ہوتی ہے، کیوں کہ ایک قسم کا مال سپلائی اور مانگ کے مطابق خود کو زیادہ آسانی سے ڈھال لیتا ہے اور دوسرا زیادہ مشکل سے۔

اب اگر پورے پھیلاؤ کے ساتھ اور بڑی مدت کے لین دین کو نظر میں رکھ کر یہ صحیح ہے کہ مال کی سب قسمیں اپنی اپنی قدروں کے حساب سے بکتی ہیں تو یہ فرض کرنا بے معنی ہوگا کہ خود منافع، ایک آدھ معاملے میں نہیں، بلکہ مختلف کاروباروں میں مستقل اور معمول کے منافع مالوں کی قیمتوں میں اوپر سے نکالے جاتے ہیں یعنی منافع اس طرح وصول ہوتے ہیں کہ چیزوں کو ان کی ویلیو سے بڑھا کر بیچا جاتا ہے۔ اگر آپ اس مفروضے کو پھیلا کر دیکھیں تو اس کی لغویت بالکل ہی سامنے آجائے۔ اگر یوں ہوتا تو آدمی جو منافع بیوپاری کی حیثیت میں اٹھاتا وہ گاہک کی حیثیت میں ہاتھ سے دیتا رہتا۔ یہ کہنے سے کام تو چلے گا نہیں کہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو بیوپاری تو ہیں گاہک نہیں یا مال اٹھانے والے (صارف) تو ہیں، بنانے والے نہیں۔ مال بنانے والے کو جو ادا کرنا ہے وہ پہلے مفت میں انہی سے وصول بھی ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص پہلے آپ سے روپیہ لے لے اور پھر مال خریدنے میں وہی روپیہ آپ کو ادا کر دے تو آپ چاہے اپنا مال اس شخص کے ہاتھ کتنا ہی مہنگا کیوں نہ بیچیں، مالدار ہونے سے رہے۔ اس طرح کے لین دین میں یہ تو ممکن ہے کہ نقصان کم ہو لیکن نفع کی کوئی گنجائش نہیں۔

لہٰذا منافع کی عام فطرت بیان کرنے کے لیے آپ کو اس کلیے سے شروع کرنا چاہیے کہ اوسط میں سارے مال اپنی اصلی ویلیو پر بیچے جاتے ہیں اور انہیں ان کی ویلیو پر بیچ کر ہی یعنی ان کے اندر جتنی لیبر کھپی ہو اسی کی نسبت سے بیچ کر منافع نکلا جاتا ہے۔ اگر منافع کو ہم اس قاعدہ کلیہ میں نہ ڈھال سکے تو پھر منافع کی کوئی تشریح نہیں ہو سکتی۔ ظاہراً یہ ایک قول محال (Paradox) معلوم ہوتا ہے اور روزانہ کے مشاہدے کے خلاف جاتا ہے۔ لیکن یہی کیا اور بھی قول محال ہیں جیسے یہ کہنا کہ زمین سورج کا چکر کاٹتی ہے یا پانی ایسی دو گیسوں سے مل کر بنا ہے جن میں بھڑک اٹھنے کی خاصیت ہے۔ سائنسی حقیقت کو اگر آپ روزمرہ کے اس تجربے سے جانچیں جو چیزوں کا صرف رواں دواں منظر دیکھتا ہے تو وہ ہمیشہ ہی قول محال نکلے گی۔

7۔ محنت کی قوت

labour Power

جتنا ممکن تھا ویلیو کا، اور کسی بھی مال کی ویلیو کی فطرت کا سرسری تجزیہ کر چکنے کے بعد اب ہمیں اپنی توجہ اس طرف پھیرنی چا

ہیے کہ محنت کی خاص ویلیو کیا ہوتی ہے۔اس دفعہ پھر میں ایک ظاہراً قول محال پیش کر کے آپ کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہوں ۔آپ سب حضرات کو یقین ہے کہ جو کچھ آپ ہر روز بیچتے ہیں وہ ہے آپ کی محنت،یعنی محنت کی ایک قیمت ہے،اور چونکہ کسی مال کی قیمت اس کی ویلیو کا نقدی میں ظاہر ہونا ہی ہے تو محنت کی ویلیو نام کی کسی چیز کا وجود ضرور ہوا۔لیکن عام معنوں میں محنت کی ویلیو جیسی کسی چیز کا وجود نہیں ہوتا۔تاہم چونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کسی مال کے اندر لازمی محنت کی جو مقدار ٹھوس شکل میں موجود ہے وہی اس کی ویلیو بنتی ہے۔تب ہم ویلیو کے بارے میں اس کلیے کو اپناتے ہوئے یہ کیسے معین کریں کہ کام کے دن کے دس گھنٹے کی ویلیو کیا ہوئی۔اس ایک دن میں کتنی محنت پڑی ہے؟ دس گھنٹے کی محنت۔یہ کہنا کہ کام کے دن کے دس گھنٹے کی ویلیو برابر ہے دس گھنٹے کی محنت کے یا اتنی محنت کے جتنی اس وقت میں سمائی ہوئی ہے، یہ لفظی الٹ پھیر بلکہ بے معنی بیان ہوگا۔مانی ہوئی بات ہے کہ جب "محنت کی ویلیو" کے صحیح اور در پردہ مفہوم تک ہماری پہنچ ہو چکی ہے تو جیسے اجرام فلکی کی صحیح رفتار کا یقین کر چکنے کے بعد ہم ظاہرا یا محض قاعدے کی پابند حرکت و رفتار کی تشریح بھی کر سکیں گے،اسی طرح اب ہم سمجھا سکتے ہیں کہ ویلیو کی اس انمل بے جوڑ اور بظاہر ناممکن سی عملی صورت کیا ہوتی ہے۔

جو چیز مزدور بیچتا ہے، وہ براہ راست اس کی محنت نہیں ہوتی ، بلکہ محنت کرنے کی طاقت (قوت محنت) ہوتی ہے جسے عارضی طور پر وہ سرمایہ دار کے حوالے کر دیتا ہے۔یہ ایسی نپی تلی بات ہے کہ قانون بنا دیے گئے ہیں۔مجھے انگلینڈ کے بارے میں تو نہیں معلوم،لیکن کم از کم یورپ کے کئی ملکوں میں ایسے قانون ہیں کہ آدمی اپنی محنت کو زیادہ سے زیادہ اتنے وقت کے لیے بیچ سکتا ہے۔اگر وقت کی کسی طرح کی قید نہ رکھی جائے تو اگر ساری عمر چلتی رہے تو وہ فوراً انسان کو عمر بھر کے لیے ملازمت دینے والے کا غلام بنا ڈالے گی۔

ایک سب سے پرانے ماہر معاشیات اور نہایت اچھوتے خیالات کے انگریز فلسفی تھومس ھوبس نے اپنی تصنیف (Leviathan) میں بے اختیار اس نکتے کو چھو لیا تھا جسے بعد والوں نے نظر انداز کر دیا۔وہ کہتا ہے:

"اور سب چیزوں کی طرح،انسان کی ویلیو یا مالیت بھی اس کی قیمت ہے،یعنی جو اس کی طاقت استعمال کرنے کے بدلے دی جاتی ہے۔"

اگر ہم اس بنیاد سے چلیں تو جیسے اور مالوں کی ویلیو نکالتے ہیں،محنت کی ویلیو کا فیصلہ بھی کر سکیں گے۔

لیکن ایسا کرنے سے پہلے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ یہ عجیب و غریب صورت حال کیونکر سامنے آئی کہ بازار میں ایک طرف تو گاہکوں کا حلقہ ہے جس کے پاس زمین ہے،مشین ہے، کچا مال ہے،ضروریات زندگی کا سروسامان ہے،اچھوتی زمینوں کے علاوہ ان میں سے ہر چیز محنت کی پیداوار ہے،دوسری طرف بیچنے والوں کی صف ہے جس کے پاس بیچنے کو کچھ ہی نہیں سوائے قوت محنت کے،سوائے محنت کرنے والے بازو اور دماغ کے؟ایک صف ایسی کہ برابر خریداری کرتی چلی جاتی ہے تاکہ منا

فع سے خود کو مالا مال کرتی رہے، دوسری صف لگا تار بیچتی رہتی ہے تا کہ گزر اوقات کا ذریعہ کمائے۔اس سوال کی چھان بین کا مطلب ہوگا اس چیز کی تحقیق جسے ماہرین معاشیات نے پہلے کی اور شروع والی جوڑ جمع کہا ہے اور جسے دراصل شروع کا قبضۂ مخالفانہ کہنا چاہئے۔اس تحقیق سے ہمیں پتہ چل جاتا کہ وہ جسے شروع والی جوڑ جمع کا نام دیا گیا ہے، اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ تاریخ کے سلسلہ وار عمل نے یہاں تک پہنچا دیا کہ محنت کرنے والے اور محنت کے اوزاروں کے درمیان جو شروع کی یگانگی چلی آتی تھی اس کے جوڑ کھل گئے۔خیر یہ تحقیق میرے پیش نظر مضمون کے دائرے سے باہر ہے۔محنت کرنے والے اور محنت کے اوزار کے درمیان یہ جدائی ایک بار ہوگئی تو پھر آگے بھی قائم رہتی ہے اور لگا تا بڑھ پیمانے پر خود کو پھیلاتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب طریق پیداوار میں ایک نیا اور گہرا انقلاب برپا ہو، اس جدائی کا تختہ الٹے اور نئی تاریخی شکل میں پہلے کی سی یگانگی پھر بن جائے۔

اچھا تو قوت محنت کی ویلیو کیا ہے؟

اور مالوں کی طرح قوت محنت کی ویلیو بھی یوں ہی طے ہوتی ہے کہ اسے پیدا کرنے کے لئے محنت کی کتنی مقدار لازم ہے۔انسان کی محنت کی طاقت صرف اس میں ہے کہ وجود جیتا جاگتا رہے۔ضروریات زندگی کی بہت ساری چیزیں ہیں کہ انسان اپنی نشو ونما اور زندگی باقی رکھنے کے لئے انہیں استعمال میں لاتا ہے۔لیکن مشین کی طرح آدمی بھی ٹوٹ کر رہ جاتا ہے، اس کی جگہ لینے کو دوسرا آدمی چاہئے۔خود اپنا وجود باقی رکھنے کی خاطر جو بہت ساری چیزیں اسے درکار ہوتی ہیں، ان کے علاوہ اسے ضروریات کی ایک اور مقدار بھی حاصل کرتی ہے تا کہ بچوں کی کسی ایک تعداد کو پال پوس کر بڑا کرے جو محنت کے بازار میں اس کی جگہ کھڑے ہو جائیں اور مزدوروں کی یہ نسل ہمیشہ چلتی رہے۔پھر یہ کہ اس کی قوت محنت کو بڑھانے اور کوئی خاص ہنر ہاتھ میں لینے کی خاطر اور بھی کچھ قدریں خرچ کرنا پڑیں گی۔ہماری موجودہ بحث کے لئے صرف اوسط محنت پر غور کرنا کافی ہوگا جس کی تعلیم اور ترقی پر برائے نام ہی خرچ آتا ہے۔تاہم اس موقع پر میں یہ جتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مختلف قسم کی قوت محنت پیدا کرنے کی لاگت میں چونکہ فرق ہوتا ہے اس لئے کاروبار کی مختلف شاخوں میں لگی ہوئی قوت محنت کی ویلیو میں بھی فرق ہونا لازم ہے۔لہٰذا یہ چیخ پکار کہ اجرتوں میں مساوات ہو، ایک غلط فہمی پر مبنی ہے اور ایسی جنونی تمنا ہے جو کبھی پوری نہیں ہونے والی۔یہ شوشہ چھوڑا ہوا ہے اس فرضی اور سطحی گرم سیاست کا جو مبدیات تو اپنا لیتی ہے لیکن نتیجوں سے جان چراتی ہے۔مزدوری کے نظام میں قوت محنت کی ویلیو اسی طرح طے پاتی ہے جیسے دوسرے کسی بھی مال کی۔اور چونکہ محنت کرنے کی مختلف طاقتوں کی قدریں بھی مختلف ہوتی ہیں، یا یہ کہ انھیں وجود میں لانے کے لئے محنت کی مختلف مقداریں درکار ہوتی ہیں اس لئے محنت کے بازار میں ان کے دام بھی الگ الگ ہونے لازمی ہیں۔اجرتوں کے اس نظام کے ہونے یہ تمنا کرنا کہ محنت کا صلہ سب کو برابر یا کچھ نہیں تو منصفانہ ملنے لگے، یہ ایسی ہی بات ہے جیسے غلامی کے نظام کے ہوتے آزادی

کے خواب دیکھنا۔جس بات کو آپ انصاف کا تقاضا یا منصفانہ سمجھ رہے ہیں اس کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔سوال صرف اتنا ہے کہ ایک مقررہ نظام پیداوار میں کیا ہونا لازمی ہے جس سے مفر نہیں۔اب تک جو کہا گیا اس سے یہ واضح ہو گیا کہ قوت محنت کی ویلیو طے پاتی ہے ان ضروریات کی ویلیو سے جو محنت کی اس قوت کو پیدا کرنے، بڑھانے، باقی رکھنے اور آئندہ جاری رکھنے میں درکار ہوتی ہیں۔

8۔قدر زائد کی پیداوار

Surplus Value

اب ہم فرض کرتے ہیں محنت کرنے والے کی روزمرہ ضروریات کی اوسط مقدار تیار کرنے کے لئے چھ گھنٹے روز کی اوسط محنت درکار ہے۔یہ بھی فرض کیجئے کہ چھ گھنٹے کی اوسط محنت سونے کی ایک مقدار میں سمائی ہوئی ہے اور یہ مقدار ہے 3 شلنگ کے برابر۔تو بھر تین شلنگ قیمت ٹھیری یا اس آدمی کی قوت محنت کے ایک دن کی ویلیو اتنی نقدی میں ظاہر ہوئی۔اگر وہ چھ گھنٹے روز کام کرے تو روزانہ اتنی ویلیو پیدا کرے گا جتنی روزمرہ ضروریات کی اوسط مقدار خریدنے کے لئے کافی ہے یا محنت کرنے والے کی حیثیت میں اسے باقی رکھنے کو پوری پڑتی ہے۔

لیکن یہ آدمی اجرت پر کام کرتا ہے۔اس لئے اپنی قوت محنت سرمایہ دار کے ہاتھ بیچنی ہی ہے۔اگر وہ تین شلنگ روز پر بیچے یا 18 شلنگ فی ہفتہ پر، تو وہ اپنی قوت اس کی ویلیو کے حساب سے بیچ رہا ہے۔فرض کیجئے، کتائی کا کام کرتا ہے۔اگر وہ چھ گھنٹے روز کام کرے تو جو کپاس کی ویلیو میں تین شلنگ روز کی ویلیو بڑھاتا ہے۔یہ جو ویلیو اس نے بڑھائی ہے، یہ ٹھیک اتنی ہی ہے جتنی اسے اجرت ملتی ہے یا روزانہ اپنی محنت کی قیمت کے طور پر وصول ہوتی ہے۔اس حالت میں سرمایہ دار کو نہ تو کوئی زائد قدر ہاتھ آئی، نہ زائد پیداوار۔یہاں ہم الجھن میں پھنستے ہیں۔

جب سرمایہ دار مزدور سے محنت کی طاقت خریدتا ہے اور اس کی قدر ادا کر دیتا ہے تو دوسرے خریداروں کی طرح اسے بھی یہ حق پہنچا کہ اپنے خریدے ہوئے مال کو خرچ یا استعمال کرے۔آپ ایک آدمی کی قوت محنت خرچ یا استعمال کرتے ہیں اسے کام میں لگا کر، ٹھیک اسی طرح جیسے کسی مشین کو چلا کر اسے صرف یا استعمال کرتے ہیں۔کام کرنے والے کی قوت محنت کی ویلیو روز کے روز یا ہفتہ وار ادا کر کے سرمایہ دار نے یہ حق حاصل کی ہے کہ پورے دن یا ہفتہ بھر کے لئے اس قوت محنت کا استعمال کرے یا سے کام سے لگائے رکھے۔اس میں شک نہیں کہ کام کا ایک دن یا ایک ہفتہ بھی کچھ حدود کا پابند ہے لیکن ان حدود پر ہم بعد میں زیادہ نزدیک غور کریں گے۔

فی الحال ایک فیصلہ کن نکتے کی طرف آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔قوت محنت کی ویلیو تو پابند ہے محنت کی اس مقدار کی جو اسے

باقی رکھنے یا پھر سے پیدا کرنے کے لئے لازم ہوتی ہے، لیکن اس قوت محنت کا استعمال وہاں تک ہوتا ہے جہاں تک مزدور میں کام کرنے کی طاقت اور جسمانی قوت موجود ہے۔ قوت کا عمل میں آنا کچھ اور، اسی طرح جیسے گھوڑا جو خوراک طلب کرتا ہے، وہ اور جتنی دیر وہ شہسوار کو سواری دیتا ہے، دونوں بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ محنت کی وہ مقدار جس پر کام کرنے والے کی قوت محنت کی ویلیو نے حد کھینچی ہوئی ہے ہرگز محنت کی اس مقدار کو محدود نہیں کرتی جو اس کی قوت محنت انجام دینے قابل ہوتی ہے۔ کتائی کرنے والے کی ہی مثال لے لیجئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ روزانہ اپنی قوت محنت کو پھر سے پیدا کرنے کے لئے اسے ہر روز تین شلنگ کی ویلیو پیدا کر کے دینی ہے جو چھ گھنٹے کے کام سے وہ پوری کر دیتا ہے۔ مگر اس کے سبب یہ نہیں ہوتا کہی اب دس، بارہ یا بارہ سے زیادہ گھنٹے کام کرنے کے قابل نہیں رہا۔ لیکن کتائی کرنے والے کی قوت محنت کو روزانہ یا ہفتہ واری ویلیو ادا کر کے سرمایہ دار نے یہ حق پایا ہے کہ محنت کی اس قوت کو سارے دن یا سارے ہفتے استعمال کرے۔ لہٰذا اب مثال کے طور پر بارہ گھنٹے بھی اس سے کام لے گا۔ ان چھ گھنٹوں کے علاوہ جو اس کی اجرت کی یا قوت محنت کی ویلیو ادا کرنے کی لئے لازم لیں اسے اوپر سے چھ گھنٹے اور کام کرنے پڑے گا جنھیں میں زائد محنت کے گھنٹے کہتا ہوں یعنی وہ فالتو محنت جو خود کو قدر زائد (Surplus value) اور زائد پیداوار میں بدل دیتی ہے۔ اگر وہ کتائی کرنے والا شخص اپنی روز کی چھ گھنٹہ محنت سے کپاس میں تین شلنگ کی ویلیو بڑھاتا ہے، یعنی جتنی اجرت پائی ہے اس کے بالکل مساوی، تو وہ برہ گھنٹے کام کر کے چھ شلنگ کی مالیت اس کپاس کو دے دیتا ہے اور اسی نسبت سے زائد دھاگا تیار کرتا ہے۔ مگر جب وہ اپنی قوت محنت سرمایہ دار کے ہاتھ بیچ چکا تو اس نے جتنی بھی ویلیو یا سامان تیار کیا وہ بھی سرمایہ دار کی ملکیت ٹھہرا کیوں کہ وہی وقتی طور پر اس کی قوت محنت کا مالک ہے۔ ظاہر ہے کہ سرمایہ دار تین شلنگ مزدور کو دے کر چھ شلنگ کی ویلیو وصول کرے گا کیونکہ اتنی ویلیو کے بدلے جس میں محنت کے چھ گھنٹے موجود ہیں، وہ ایسی ویلیو وصول کرتا ہے جس میں محنت کے بارہ گھنٹے جمع ہیں۔ روزانہ اسی عمل کو دوہرا کر سرمایہ دار ہر روز تین شلنگ دیتا اور چھ شلنگ اپنی جیب میں ڈالتا رہے گا جس کا آدھا حصہ پھر اجرت کی شکل میں دیا جائے گا اور باقی آدھا فالتو ویلیو (قدر زائد) بنتا جائے گا جس کے عوض سرمایہ دار کو کچھ ادا نہیں کرتا۔ سرمائے اور محنت کے درمیان تبادلے کا یہ ہے وہ انداز جس پر سرمایہ داری پیداوار یا اجرت کا نظام کھڑا ہوا ہے اور جس کا مستقل نتیجہ یہی ہوگا کہ محنت کرنے والے کو پھر مزدور اور سرمایہ دار کو پھر سرمایہ دار بناتا چلا جائے۔

باقی سب حالات یکساں ہوں تو قدر زائد کی شرح منحصر ہوتی ہے اس پر کہ قوت محنت کی ویلیو پھر سے پیدا کرنے کے لیے کام کے جتنے گھنٹے دینے ضروری ہیں ان میں اور جو زائد وقت یا زائد محنت سرمایہ دار کے لئے دئے گئے ان میں کیا تناسب ہے۔ لہٰذا جس حد تک مزدور اپنی قوت محنت کی ویلیو یا اجرت کا حساب پورا کرنے کے لئے کام کرتا ہے، ان گھنٹوں سے زائد یا فالتو کام کے جتنے گھنٹے ہوں گے، ان دونوں وقتوں کے تناسب پر قدر زائد کی شرح منحصر رہے گی۔

9۔محنت کی ویلیو

Value of Labour

اب ہمیں اسی بیان کی طرف واپس آنا ہوگا کہ "محنت کی ویلیو یا اس کی قیمت"۔

ہم نے دیکھ لیا کہ حقیقت میں وہ صرف قوت محنت کی ویلیو ہے جو اس سامان کی قدروں میں ناپ کر دی جاتی ہے جس سامان کا ہونا لازمی ہے قوت محنت باقی رکھنے کے لئے۔لیکن چونکہ محنت کرنے والے کو کام پورا چکنے کے لئے۔لیکن چونکہ محنت کرنے والے کو کام پورا کر چکنے کے بعد اجرت ملتی ہے اور پھر وہ خود سمجھتا ہے کو اس نے سرمایہ دار کو جو کچھ دیا وہ اس کی محنت تھی تو اپنی قوت محنت کی ویلیو یا قیمت اسے لازمی طور سے خود اپنی محنت کی ہی قیمت یا ویلیو نظر آتی ہے۔اگر اس کی قوت محنت کی قیمت تین شلنگ ہو جس میں چھ گھنٹے کی محنت وصول ہو جاتی ہے اور پھر وہ بارہ گھنٹے خود چھ شلنگ کی ویلیو میں لگے ہونے ہیں۔اس عمل کی دوہری تاثیر ہوتی ہے:

اول یہ کہ قوت محنت کی ویلیو یا قیمت ایسی نظر آتی ہے گویا خود محنت کی ہی ویلیو یا قیمت ہے۔حالانکہ اگر سچ پوچھئے تو محنت کی ویلیو یا قیمت کے کچھ معنی نہیں ہوتے۔

دوسرے یہ کہ اگر چہ کام کرنے والے کی روزانہ محنت کا صرف ایک حصہ ہے جس کی اجرت ادا کی گئی، دوسرا حصہ ادائگی کے بغیر رہا۔یہی حصہ یا زائد (فالتو) محنت اصل میں وہ ذخیرہ ہے جس مین سے قدر زائد یا منافع نکلتا ہے،لیکن بظاہر یوں نظر آتا ہے گویا مجموعی طور پر محنت کا معاوضہ دیا گیا۔

یہ ظاہر کا دھوکا اجرت پر کی ہوئی مزدوری کو محنت کی دوسری تاریخی شکلوں سے جدا کر دیتا ہے۔اجرت کا نظام کچھ اس طرح کا بنا ہوا ہے کہ بے معاوضہ محنت بھی اجرت دی ہوئی محنت نظر آتی ہے۔غلام کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔اس کی محنت کے جس حصے کا معاوضہ دیا جاتا تھا وہ بھی دیکھنے میں مفت کی بیگار تھی۔لازمی بات ہے کہ کام کرنے کی خاطر غلام کو زندہ رہنا چاہئے لہٰذا محنت کے دن کا ایک حصہ اس ویلیو کو پورا کرنے میں لگ جاتا ہے جو اس کا وجود باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے۔لیکن چونکہ کہ غلام اور آقا کے درمیان کوئی سودا نہیں ہوتا اور فریقین میں خرید و فروخت کا معاملہ نہیں بنتا تو اس کی ساری محنت یوں نظر آتی ہے گویا مفت کی تھی۔

اب دوسری طرف زمین سے بندھے ہوئے (نیم غلام) کسان کو لے لیجئے جو ابھی کل تک سارے مشرقی یورپ میں موجود تھا۔یہ کسان، مثلاً تین دن تو خود اپنے کھیت پر، یا جو کھیت اسے سونپا گیا ہے، وہاں اپنے لئے کام کرتا تھا اور باقی کے تین دن آقا یا مالک کی جاگیر پر جبری محنت یا بیگار بھرتا تھا۔یہاں پھر محنت کا وہ حصہ جس کا معاوضہ ملا، اور وہ جس کا نہیں ملا، سلیقے کے ساتھ الگ الگ تھے، وقت اور مقام میں بھی جدا جدا تھے۔ہمارے آزاد خیالوں کو اس پر بے حد غصہ آیا کرتا تھا کہ

آدمی سے اور بے معاوضہ محنت لی جائے۔اس کو وہ اخلاقی گراوٹ سمجھتے تھے۔

سچ یہ ہے کہ چاہے ایک آدمی ہفتے کے تین دن خود اپنے کھیت پر اپنے لئے اور باقی کے تین دن مالک کی جاگیر پر بے معاوضہ محنت کرتا ہے، چاہے وہ کسی کارخانے یا ورکشاپ میں چھ گھنٹے روز اپنے لئے اور چھ گھنٹے مالک کے لئے کام کرتا ہے بات ایک ہی ہوئی۔اگرچہ فیکٹری یا ورکشاپ کے معاملے میں معاوضہ والی اور بے معاوضہ محنت، دونوں ایک دوسری میں ایسی گتھی ہوئی ہیں کہ الگ نہیں کیا جا سکتا، اور اس پورے لین دین کی فطرت پر یہ پردہ پڑا ہوا ہے کہ درمیان میں ایک معاہدے کا دخل ہے اور ادائگی ہوتی ہے ہفتہ پورا ہونے کے بعد۔بے معاوضہ محنت ایک معاملے میں اپنی مرضی سے پیش کی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور دوسرے معاملے میں زبردستی کی۔لے دے کر بس اتنا سا فرق ہے ان دونوں میں۔

اب جو میں "محنت کی ویلیو" کا لفظ استعمال کروں گا تو محض غلط العام معنوں میں، جس کا مطلب ہے "قوت محنت کی ویلیو"۔

10۔کسی مال کو اس کی ویلیو پر فروخت کر کے منافع کمایا جاتا ہے

فرض کیجئے۔محنت کا ایک اوسط گھنٹہ جو ویلیو میں لگا ہوتا ہے، وہ چھ پینس کے برابر ہے، یا بارہ اوسط گھنٹے چھ شلنگ کی ویلیو کے برابر ٹھہرتے ہیں۔آگے فرض کیجئے کہ محنت کی ویلیو تین شلنگ یا اتنے سامان کے برابر ہوئی جتنا چھ گھنٹے کی محنت نے پیدا کیا ہے۔اب اگر کچے مال، مشین اوزار وغیرہ میں، جو کسی مال کی تیاری میں استعمال ہو ہے، چوبیس گھنٹے کی اوسط محنت لگی ہوئی ہے تو اس کی ویلیو بارہ شلنگ تک پہنچے گی۔اور پھر سرمایہ دار نے جس آدمی کو محنت پر لگایا ہے اس نے پیداوار کے ذریعوں پر اپنی بارہ گھنٹے کی محنت بڑھائی ہو تو ان بارہ گھنٹوں نے چھ شلنگ کی مزید ویلیو پیدا کی۔اب اس مال کی پوری ویلیو مل کر وصول شدہ محنت کے چھتیس گھنٹے اور اٹھارہ شلنگ کے برابر ہوگئی۔مگر چونکہ محنت کی ویلیو یا وہ اجرت جو کام کرنے والے کو دی گئی، صرف تین شلنگ ہوگی تو سرمایہ دار کی طرف سے ان چھ گھنٹے کی فالتو محنت کے بدلے کچھ نہیں دیا گیا جو مزدور نے کی اور مال کی دیلیو کی صورت میں وصول ہو چکی۔اس مال کی جو اٹھارہ شلنگ ویلیو بنی ہے، اسی ویلیو پر بیچ کر سرمایہ دار کے ہاتھ تین شلنگ کی ایک ایسی ویلیو آئے گی جس کے بدلے اس نے کچھ نہیں دیا۔یہی تین شلنگ وہ قدر زائد یا منافع بنا ہے جو اس نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔سرمایہ دار کو یہ تین شلنگ کا منافع برابر وصول ہوتا رہے گا، ایسا منافع جو وہ اپنا مال اصلی ویلیو سے زیادہ یا اونچی قیمت پر نہیں بلکہ اس کی اصلی ویلیو پر بیچ کر حاصل کرتا ہے۔

کسی مال کی ویلیو محنت کی اس پوری مقدار سے طے پاتی ہے جو اس کے اندر موجود ہے۔اس محنت کا ایک حصہ وہ ہے جو اس ویلیو کی صورت میں موجود ہے جس کا مساوی اجرت کی شکل میں ادا کیا جا چکا، لیکن ایک حصہ ایسی ویلیو میں رہا جس کا مساوی کچھ ادا نہیں کیا گیا۔مال کے اندر جو محنت سمائی ہوئی ہے، اس کا ایک حصہ معاوضہ والی محنت ہے اور دوسرا حصہ بے

معاوضہ کی محنت۔اس لئے جب سرمایہ دار کسی مال کو اس کی اپنی ویلیو پر فروخت کرتا ہے، یعنی محنت کی اس پوری مقدار کو حساب میں لیتا ہے جو اس مال کے اندر ٹھوس شکل رکھتی ہے تو اسے منافع ہونا بہر حال لازم ہے۔صرف وہی چیز نہیں بیچ رہا ہے جس کے مساوی لاگت آ چکی، بلکہ وہ شے بھی فروخت کی جا رہی ہے جس کا اسے خود کچھ نہیں دینا پڑا، البتہ مزدور کی محنت اس میں لگی ہے۔سرمایہ دار کو جو لاگت کسی مال کی پڑی ہے۔وہ ایک چیز ہے اور اس مال کی اصلی ویلیو دوسری چیز۔چنانچہ اب میں پھر دوہراتا ہوں کہ اوسط یا معمولی منافع کمایا جاتا ہے کسی مال کو اس کی ویلیو سے زیادہ پر بیچ کر نہیں بلکہ اصلی ویلیو پر بیچ کر۔

11۔وہ مختلف حصے جن میں قدر زائد بکھر جاتی ہے

قدر زائد یا کسی مال کی پوری ویلیو کا وہ حصہ جس میں مزدور کی فالتو محنت یا بے معاوضہ محنت لگی ہوئی ہے، میں اسے منافع کہتا ہوں۔یہ پورے کا پورا منافع کام لینے والے سرمایہ دار کی جیب میں نہیں جاتا۔زمین کا اجارہ زمیندار کو یہ موقع دیتا ہے کہ اس قدر زائد کا ایک حصہ وہ لگان یا کرائے کے نام سے لے جائے، چاہے زمین کاشت کے لئے استعمال ہو، عمارت کے لئے، ریلوے یا کسی اور پیداواری مقصد کے لئے کام آئے۔دوسری طرف یہ بھی ہے کہ جب محنت کے اوزاروں کی ملکیت نے کام لینے والے سرمایہ دار کو اس قابل بنا کہ وہ قدر زائد پیدا کر سکے یا یوں کہئے کہ بے معاوضہ محنت کی ایک خاص مقدار ہتھیا سکے، تو وہ جس کے پاس محنت کے ذریعوں کی ملکیت تھی اور جو اپنی یہ ملکیت پوری کی پوری یا تھوڑی بہت کام لینے والے سرمایہ دار کو ادھار دیتا تھا، اسے بھی یہ موقع دیا، یعنی ساہوکار سرمایہ دار کو اس قبل کیا کہ وہ سود کے نام سے اسی قدر زائد کے ایک حصے پر خود اپنا حق جما لے۔چنانچہ ان دونوں کو دینے کے بعد کام لینے والے سرمایہ دار کے پاس جتنا کچھ بچتا ہے وہ صرف اسی قدر ہے جسے صنعتی یا تجارتی منافع کہتے ہیں۔

اب رہا سوال کہ وہ کون سے اصول ہیں جن سے قدر زائد کی ساری مقدار ان تین قسم کے آدمیوں کے درمیان قاعدے سے تقسیم ہوتی ہے، یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔البتہ اب تک جو کہا گیا اس سے یہ نتیجے نکلتے ہیں۔

لگان یا کرایہ، سود اور صنعتی منافع یہ الگ الگ نام ہیں کسی مال کی قدر زائد کے مختلف حصوں کے، یا اس محنت کے جو مال کے اندر موجود ہے لیکن جس کا معاوضہ نہیں دیا گیا۔یہ تینوں اسی ذریعے سے اسر صرف اسی ایک ذریعے سے نکالے جاتے ہیں۔نہ تو خود زمین سے ان کی اگائی ہوتی ہے اور نہ سرمائے سے، البتہ زمین اور سرمایہ اپنے اپنے مالکوں کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ اس قدر زائد میں سے اپنا اپنا حصہ وصول کر لیں جو کام لینے والے سرمایہ دار نے مزدور سے نکالی ہے۔خود مزدور کی نظر میں یہ بات بعد کی ہے کہ وہ قدر زائد جو اس کی زائد یا فالتو محنت یا مفت کی محنت کا حاصل تھی، پوری کی پوری کام لینے والے سرمایہ دار نے جیب میں ڈالی یا اس کے حصے بخرے کرائے اور سود کے نام سے دوسرے فریقوں کو بھی دئے۔فرض

کیجئے جس سرمایہ دار نے کام لیا ہے، سرمایہ بھی اس نے اپنا ہی لگایا اور زمین کا مالک بھی وہ خود تھا تو اس صورت میں پوری قدر زائد اسی کی جیب میں جائے گی۔

کام لینے والا سرمایہ دار ہی ہے جو مزدور سے سیدھے سیدھے قدر زائد نکال لیتا ہے، چاہے بعد میں اس کا کتنا ہی حصہ اپنے پاس رکھ سکے۔ یہی وہ تعلق ہے، کام لینے والے سرمایہ دار اور مزدوری کرنے والے کا، جس پر سارا اجرتی نظام تو کیا، آج کا پورا نظام پیداوار ٹکا ہوا ہے۔ کچھ حضرات جو یہاں ہماری بحث میں شریک ہوئے ہیں یہ غلطی کر گئے کہ معاملے کی لیپا پوتی کر کے وہ یہ جتانے کی کوشش میں تھے کہ کام لینے والے سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان یہ تعلق ثانوی حیثیت رکھتا ہے، اگر چہ وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ موجودہ حالات میں قیمتوں کا چڑھنا کام لینے والے سرمایہ دار پر، زمین کے مالک پر، روپیہ دینے والے سرمایہ دار پر اور اتنا اور بڑھا لیجئے کہ ٹیکس اگھانے والے پر یکساں نہیں بلکہ مختلف درجوں میں اثر انداز ہوگا۔ یہیں سے ایک اور نتیجہ بھی نکلتا ہے۔

مال کی ویلیو کا وہ حصہ جس میں استعمال شدہ کچے مال، مشینری کی ویلیو، یا مختصر یہ کہ ذرائع پیداوار کی ویلیو شامل ہے وہ آمدنی ہرگز شمار نہیں ہوتا بلکہ صرف لگے ہوئے سرمائے کے حساب میں رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس سوال سے قطع نظر یہ کہنا صحیح نہیں کہ مال کی ویلیو کا وہ دوسرا حصہ جو آمدنی شمار ہوتا ہے، وہ اجرتوں، منافع، کرائے اور سود کی مدوں میں خرچ کیا جاتا ہے، وہ اجرتوں، کرائے اور منافع وغیرہ کی سب قدروں سے مل کر بنتا ہے۔ اول تو ہم اس بحث سے اجرتوں کا سوال ہی خارج کر دیتے ہیں اور صرف صنعتی منافع، سود اور کرائے پر نظر رکھیں گے۔ ابھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ کسی مال میں جو قدر زائد ہوتی ہے، یا اس کی ویلیو کا وہ حصہ جس میں بے معاوضہ محنت لگی ہوتی ہے، تین ٹکڑوں میں متفرق ہو جاتا ہے اور تینوں کے الگ الگ نام ہیں۔ لیکن یہ کہنا حقیقت کے بالکل برعکس ہوگا کہ مال کے اس حصے کی ویلیو ان تینوں اجزا کی الگ الگ قدروں اس میں جوڑ دینے سے بنتی ہے یا مرکب ہوتی ہے۔

اگر محنت کا ایک گھنٹہ خود کو چھ پینس کی ویلیو میں سماتا ہے، اگر مزدور کا دن بارہ گھنٹے پر پھیلا ہوا ہے، اور اس بارہ گھنٹے کا آدھا وقت بے معاوضہ محنت میں جاتا ہے تو یہ زائد یا فالتو محنت کسی مال میں تین شلنگ کی قدر زائد کا اضافہ کرتی ہے یعنی ایسی ویلیو بڑھاتی ہے جس کے عوض کچھ نہیں دیا گیا۔ تین شلنگ کی یہ قدر زائد ہی وہ پورا فنڈ ہے جس کا بٹوارہ زمیندار اور ساہوکار کے ساتھ، جس تناسب سے بھی ہو، کام لینے والا سرمایہ دار کر لے گا۔ ان تین شلنگ میں ویلیو کی وہ حد موجود ہے جس کے اندر تینوں کو حصہ بٹانا ہے۔ کام لینے والا سرمایہ دار کسی مال کی ویلیو میں اپنی طرف سے کوئی ایسی یک طرفہ ویلیو نہیں بڑھاتا جو اپنا منافع نکالنے کیلئے ہو اور اس میں زمیندار وغیرہ کے لئے الگ سے ویلیو بڑھائی جائے، تاکہ اس طرح اوپر سے یکطرفہ بڑھائی ہوئی مقررہ قدریں مل کر ایک مجموعی ویلیو بن جائیں۔ اب آپ نے دیکھا کہ یہ عام خیال کتنا بے بنیاد ہے جسے نظر

نہیں آتا کہ ایک مقررہ ویلیو کا تین حصوں میں بکھر جانا اور الگ الگ تین قدروں کا آپس میں آکر ملنا کیا فرق رکھتا ہے، یہ سمجھنا غلط ہے کہ ایسی حاصل جمع ویلیو جس میں کرایہ بھی ادا کیا جاتا ہے، نفع اور سود بھی نکالا جاتا ہے، جتنی چاہے بڑھائی جاسکتی ہے۔

منافع کی پوری رقم جو سرمایہ دار کو وصول ہوئی اگر سو پونڈ کے برابر ہو تو ہم اس رقم کو اس کی پوری گنجائش نظر میں رکھتے ہوئے، منافع کی رقم کہیں گے۔ لیکن اگر ان سو پونڈ اور اس سرمائے کا تناسب دیکھیں جو پیشگی دیا جاچکا ہے تو ہم اس کو نسبتی یا تقابلی گنجائش سے شرح منافع کا نام دیں گے۔ صاف بات ہے کہ یہ شرح منافع دوسرے طریقے سے خود کو ظاہر کرتی ہے۔

فرض کیجئے سو پونڈ وہ سرمایہ ہے جو اجرت میں پیشگی دیا گیا۔ اگر قدر زائد بھی سو پونڈ کی پیدا کی گئی، تو اس کا مطلب ہے کہ محنت کرنے والے کا آدھا وقت بے معاوضہ محنت میں لگ گیا۔ اب ہم اس منافع کو سرمائے کی اس ویلیو سے ناپیں جو اجرت میں دی گئی، تو ہم کہیں گے کہ شرح منافع سو فیصدی تھی کیوں کہ جتنی ویلیو پیشگی میں گئی وہ سو تھی اور جو ویلیو وصول ہوئی وہ دو سو تھی۔ لیکن دوسری طرف دیکھئے، اگر وہ سرمایہ جو اجرت میں دیا گیا، ہم صرف اسی کو شمار نہیں کرتے بلکہ اس تمام سرمائے کو حساب میں رکھتے ہیں جو پیشگی لگایا گیا، مثال کے طور پر وہ پانچ سو ہوا اور اس میں چار سو وہ ہیں جن میں کچے مال، مشین وغیرہ کی ویلیو شامل ہیں تو اب ہم کہیں گے کہ شرح منافع محض بیس فیصدی ہے، کیوں کہ جو سو پونڈ کا منافع ہے وہ پورے لگائے ہوئے سرمائے کا صرف پانچواں حصہ ہے۔

شرح منافع ظاہر کرنے کا صرف پہلا ہی انداز ایسا ہے جس سے آپ پر صحیح نسبت ظاہر ہوتی ہے کہ کتنی محنت کا معاوضہ دیا گیا اور کتنی محنت کا نہیں، یعنی (محنت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا) exploitation کا (فرانسیسی لفظ کے استعمال کی اجازت دیجئے) صحیح اندازہ بتا دیتا ہے۔ لیکن شرح منافع ظاہر کرنے کا دوسرا انداز عام استعمال ہے اور واقعی اس سے بعض مقصد پورے ہوتے ہیں۔ کچھ بھی سہی، یہ انداز بہت مفید ہے یہ چھپانے کے لئے کہ سرمایہ دار محنت کرنے والے سے کتنے درجے مفت کی محنت لے لیتا ہے۔

اب آگے جو خیالات مجھ کو ظاہر کرنے ہیں وہاں لفظ منافع سے میری مراد ہوگی قدر زائد کی وہ پوری مقدار جو سرمایہ دار نکال لیتا ہے دوسرے فریقوں کے ساتھ وہ جو بھی حصہ بٹائے، مجھے اس سے مطلب نہیں۔ اور لفظ شرح منافع سے میں ہر جگہ منافعوں کو اس سرمائے کی ویلیو سے ناپوں گا جو اجرت میں دیا جاتا ہے۔

12۔ منافع، اجرت اور قیمتوں کا باہمی رشتہ

کسی مال کی ویلیو میں سے اتنی ویلیو گھٹائیے جو کچے مال اور دوسرے ذرائع پیداوار کی شکل میں استعمال ہو چکی ہے، یعنی

اتنی ویلیو گھٹے جو پچھلی لیبر کی طرف سے اس مال میں شامل ہے۔اب جو ویلیو بچی وہ محنت کی اس مقدار کا حاصل ہے جسے آخر ی محنت کرنے والے نے بڑھایا ہے۔اگر اس آدمی نے بارہ گھنٹے روز کام کیا اور بارہ گھنٹے کی اوسط محنت خود کو سونے کی اتنی مقدار میں ڈھال لیتی ہے جو چھ شلنگ کے برابر ہے تو یہ صرف چھ شلنگ کی ویلیو ہی وہ ہے جسے اس کی محنت نے پیدا کیا ہے۔ یہی ویلیو جو اس کے وقت محنت سے طے پائی ہے ایسا فنڈ ہے جس کے اندر سے محنت کرنے والا اور سرمایہ دار دونوں ہی اپنا اپنا حصہ یا فائدہ نکالتے ہیں؛ یہی ایک ویلیو ہے جو اجرت اور اور منافع میں تقسیم کی جاتی ہے۔ظاہر بات ہے کہ ویلیو چاہے کسی تنا سب کے فرق سے دونوں فریقوں میں بانٹی جائے اس ویلیو کی مجموعی گنجائش میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔اور پورے معاملے میں بھی اسباب سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں کہ ایک محنت کرنے والے کی جگہ آپ پوری مزدور آبادی کو رکھ دیں یا مثلاً محنت کے ایک دن کے بجائے آپ ایک کروڑ بیس لاکھ دن شمار کر لیں۔

اب چونکہ سرمایہ دار اور مزدور کو اسی ایک محدود ویلیو میں ساجھا کرنا ہے، یعنی وہی ویلیو بانٹنی ہے جس کا ناپ ہوتا ہے مزدور کی پوری محنت سے، اس لیے دونوں میں سے ایک کو جتنا زیادہ ملے گا دوسرے کو اتنا ہی کم ہاتھ آئے گا یا اس کے برعکس۔اگر ایک مقررہ مقدار ہو تو اس کا ایک حصہ جتنا بڑھے گا دوسرا حصہ اسی نسبت سے گھٹے گا۔اگر اجرتوں میں تبدیلی ہو تو منافع میں الٹی طرف تبدیلی ہوگی۔اجرت کم ہوگی تو منافع بڑھے گا، اور اجرت بڑھے گی تو منافع گھٹے گا۔جیسا کہ ہم نے فرض کیا تھا اگر مزدور کو تین شلنگ ملتے ہیں تو جو ویلیو اس نے پیدا کی یہ اس کے آدھے کے برابر ہے، یا اس کی محنت کا پورا دن آدھی معاوضہ وا لی اور آدھی بے معاوضہ محنت میں جاتا ہے تو شرح منافع سو فیصدی ہوئی کیونکہ سرمایہ دار کو بھی تین ہی شلنگ ملنے والے ہیں۔ اگر مزدور کو صرف دو شلنگ ملے، یعنی دن بھر کی صرف تہائی محنت اپنی ذات کے لیے استعمال کی تو سرمایہ دار کو چار شلنگ ملیں گے اور شرح منافع ہوگی دو سو فیصدی۔اگر مزدور کو چار شلنگ ملے تو سرمایہ دار کے ہاتھ صرف دو شلنگ آئیں گے اور شرح منافع پچاس فیصدی رہ جائے گی۔یہ اونچ نیچ جتنی ہوتی رہے اس سے مال کی ویلیو پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔اس لئے اجرتوں میں عام اضافے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عام شرح منافع گر جائے لیکن اس کا قدروں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اگرچہ مالوں کی یہ قدریں جو آخر میں جا کر ان کے بازار دام گھٹاتی بڑھاتی یں، قطعی طور پر طے پاتی ہیں محنت کی اس پوری مقدار سے ہی جو ان مالوں کی اندر لگی ہوئی ہو، اور اس سے کچھ تعلق نہیں رکھتیں کہ کتنی محنت کا معاوضہ ادا ہو، کتنی بے معاوضہ رہی، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کسی ایک مال یا کئی مالوں کی ویلیو جو مثلاً بارہ گھنٹے میں تیار ہوئی ہے وہ ایک ہی حال پر قائم رہتی ہے۔محنت کے ایک مقررہ وقت یا ایک مقررہ مقدار میں مالوں کی جتنی تعداد یا کھیپ بن کر تیار ہوتی ہے اس کا انحصار ہے لگی ہوئی محنت کی قوت پیداوار پر۔اس پر نہیں کہ کتنا وقت محنت لگا۔مثال کے طور پر کتائی کے کام میں ایک تو اس درجے کی وقت پیداوار والی محنت ہو سکتی ہے کہ بارہ گھنٹے کے کام سے سے بارہ پونڈ دھاگا تیار کر دے اور کچھ کم درجے کی قوت

پیداوار والی محنت اتنی دیر میں صرف دو پونڈ تیار کر سکے۔ اب اگر بارہ گھنٹے کی اوسط محنت چھ شلنگ کی ویلیو میں وصول ہوتی ہے تو ایک موقع پر بارہ پونڈ دھاگے کی قیمت چھ شلنگ ہوگی اور دوسرے موقع پر دو پونڈ دھاگے کی لاگت بھی چھ شلنگ آئے گی۔ اس لئے ایک جگہ تو ایک پونڈ دھاگا کا چھ پینس کا پڑا اور دوسری جگہ تین شلنگ کا۔ قیمت کا یہ فرق نتیجہ ہے اس بات کا کہ جو محنت لگی تھی اس کی قوت پیداوار میں فرق تھا۔ محنت کا ایک گھنٹہ، اگر قوت پیداوار کم ہو تو محنت کے چھ گھنٹے سے ایک پونڈ دھاگا وصول ہوگا۔ چنانچہ ایک موقع پر تو ایک پونڈ دھاگے کی قیمت صرف چھ پینس ہوگی چاہے اجرت نسبتاً زیادہ ہو اور شرح منافع کم۔ اور دوسرے موقع پر اتنے ہی دھاگے کی قیمت تین شلنگ ہوگی، چاہے اجرت کم ہو اور شرح منافع زیادہ۔ وجہ اس کی یہ کہ ایک پونڈ دھاگے کی قیمت محنت کی اس پوری مقدار سے ہی گھٹتی بڑھتی ہے جو اس کی تیاری میں لگ چکی ہے، محنت کی وہ پوری مقدار معاوضہ والی اور بے معاوضہ محنت میں چاہے کسی نسبت سے تقسیم ہوتی رہے۔ وہ حقیقت جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں کہ زیادہ داموں والی محنت کم قیمت مال تیار کر سکتی ہے اور کم دام والی محنت مہنگا مال، اب اس بیان میں کوئی قول محال نظر نہیں آئے گا۔ اس میں محض ایک عام اصول پیش کیا گیا تھا کہ کسی مال کی ویلیو محنت کی اس مقدار کے مطابق رہتی ہے جو اس مال میں لگی ہو، اور محنت کی مقدار کے مطابق رہتی ہے جو اس مال میں لگی ہو، اور محنت کی مقدار لے کر منحصر ہے لگی ہوئی محنت کی قوت پیداوار پر چنانچہ محنت کی پیداواری قوت کے ہر ایک فرق کے ساتھ اس میں بھی فرق پڑے گا۔

13۔ وہ خاص موقع جب اجرت کو بڑھانے یا اسے گرنے سے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اب ہمیں سنجیدگی سے ان موقعوں پر غور کرنا چاہئے جہاں یا تو اجرت بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے یا سے گرنے سے روکنے کے لئے مقابلی کیا جاتا ہے۔

1۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قوت محنت کی ویلیو یا عام لفظوں میں محنت کی ویلیو ضروریات زندگی کی ویلیو سے طے پاتی ہے یا محنت کی اس مقدار سے طے پاتی ہے جسے ان ضروریات کی تیاری میں لگانا پڑے۔ اب اگر کسی ملک میں مزدور کی روزمرہ اوسط ضروریات کی ویلیو چھ گھنٹے کی محنت کے برابر ہے جو تین شلنگ میں ظاہر ہوتی ہے تو مزدور کو چھ گھنٹے روز کام کرنا ہوگا تا کہ وہ روز کی گزراوقات کے مساوی پیدا کر سکے۔ اور اگر کام کا پورا دن بارہ گھنٹے کا ہو تو سرمایہ دار اس کی محنت کی ویلیو تین شلنگ میں ادا کرے گا۔ کام کا آدھا دن بے معاوضہ جائے گا اور شرح منافع ٹھیرے گی سو فیصدی۔ لیکن آگے فرض کیجئے کہ قوت پیداوار کم ہونے کے باعث، یوں کہیے کہ زرعی پیداوار کی اتنی ہی مقدار اٹھانے کے لئے محنت کی زیادہ مقدار چاہئے۔ اور اس کے سبب روزمرہ اوسط ضروریات کی قیمت تین سے بڑھ کر چار شلنگ ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں محنت کی ویلیو ایک تہائی بڑھ گئی۔ پہلے کے معیار زندگی سے مزدور کی روز کی گزراوقات کے مساوی پیدا کرنے کے لئے اب کام کے آٹھ گھنٹے لگانے

ضروری ہو جائیں گے چنانچہ زائد یا فالتو محنت چھ سے چار گھنٹے ہی رہ جائے گی اور شرح منافع سو سے گھٹ کر 50 فیصدی پر آ جائے گی۔ اپنی اجرت بڑھوانے کے لئے مزدور جب زور دے گا تو وہ اصرار کرے گا محض اس بات پر کہ اس کی محنت کی بڑھی ہوئی ویلیو ادا کی جائے جیسا کہ کوئی بھی مال بیچنے والا، جس کے مال کی لاگت بڑھ چکی ہو، اس کوشش میں رہتا ہے کہ اس کے مال کی بڑھی ہوئی ویلیو ادا کی جائے۔ اگر اجرت نہیں بڑھتی یا تسلی بخش حد تک نہیں بڑھتی کہ ضروریات زندگی کی بڑھی ہوئی ویلیو کو پوری بڑھ سکے تو محنت کی قیمت اس کی ویلیو سے نیچے اتر جائے گی اور مزدور کا معیار زندگی بگڑ جائے گا۔

مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تبدیلی مخالف سمت میں ہو۔ محنت کی قوت پیداوار بڑھی ہونے کی بدولت روزمرہ اوسط ضروریات کی اتنی ہی مقدار ممکن ہے کہ تین شلنگ کے بجائے دو شلنگ پر اتر آئے یا یوں کہئے کہ کام کے دن میں چھ میں بجائے صرف چار گھنٹے کافی ہونے لگیں روزمرہ ضروریات کی ویلیو کے مساوی پیدا کرنے کو۔ اب محنت کرنے والا دو شلنگ میں ہی اتنی ضروریات خرید سکے گا جتنی وہ تین شلنگ میں خریدا کرتا تھا۔ محنت کی ویلیو بے شک گری لیکن وہ گری ہوئی ویلیو مال کی اتنی ہی مقدار پر حاوی ہے جتنی پہلے تھی۔ ایسی حالت میں منافع تین سے چار شلنگ ہو جائے گا اور شرح منافع سو سے دو سو فیصدی۔ اگرچہ مزدور کا قطعی معیار زندگی جہاں تھا وہیں رہا لیکن اس کی نسبتی اجرت اور ساتھ میں اس کی نسبتی سماجی حیثیت سرمایہ دار کے مقابلے میں اور گر گئی۔ اب اگر کام کرنے والا نسبتی اجرت کو اور گرنے سے روکنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ صرف اسی کوشش میں ہے کہ خود اپنی محنت کی بڑھی ہوئی قوت پیداوار میں کچھ حصہ بٹائے اور سماجی پیمانے پر اپنی پہلے کی نسبتی حیثیت کو سنبھالے رکھے۔ چناں چہ جب انگلینڈ میں اناج کا قانون منسوخ کیا گیا اور اس قانون کے منسوخ کرانے کے ایجی ٹیشن کے دنوں میں جو حلفیہ وعدے کئے گئے تھے ان کی کھلی خلاف ورزی کر کے انگریز مل مالکوں نے عام طور سے اجرتیں دس فیصدی گھٹا دیں تو مزدوروں نے ٹکر لی۔ شروع میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ لاحاصل رہی۔ لیکن بعد میں کچھ ایسے اسباب کی بدولت جن کا بیان میں فی الحال نہیں کر سکتا، وہ کٹی ہوئی دس فیصدی اجرت پھر وصول کر لی گئی۔

2۔ ضروریات زندگی کی ویلیو ممکن ہے وہی رہے جو تھی اور اس کے نتیجے میں محنت کی ویلیو بھی وہی رہے، لیکن ان کی نقد قیمت میں فرق آ جائے کیوں کہ روپے کی ویلیو پہلے بدل چکی۔

مثلاً یہ ہو سکتا ہے کہ زیادہ زرخیز کانیں دریافت ہونے یا کسی اور وجہ سے دو اونس سونا حاصل کرنے کی محنت اتنی ہی رہ جائے جتنی پہلے ایک اونس سونے میں لگتی تھی۔ اس صورت میں سونے کی ویلیو گھٹ کر آدھی یا پچاس فیصدی رہ جائے گی۔ اب چونکہ تمام مالوں کی ویلیو پہلے سے دوگنی رقم میں ظاہر کی جائے گی تو محنت کی ویلیو کا بھی یہی ہوگا۔ بارہ گھنٹے کی محنت جو پہلے چھ شلنگ میں ظاہر ہوتی تھی اب بارہ شلنگ میں ہونے کے بجائے اب بھی تین ہی شلنگ رہی تو اس کی محنت کی نقد قیمت محنت کی ویلیو سے آدھی رہ جائے گی اور اس کا معیار زندگی بہت بری طرح گرے گا۔ اگر اس کی اجرت بڑھ بھی جائے لیکن

اس تناسب سے نہ بڑھے جس سے سونے کی ویلیوگری ہے تب بھی محنت کی نقد ویلیوگر نا کم وبیش ویسا ہی رہے گا۔ایسے موقع پر اور کچھ نہیں بدلا۔محنت کی پیداواری قوت، مانگ اور سپلائی یا مالوں کی قدریں سب جوں کی توں رہیں۔انقدروں کے نام جو نقد رقموں کی صورت میں ہوتے ہیں، ان کے سوا کوئی شے تبدیل نہیں ہوئی۔یہ کہنا کہ اس صورت میں مزدور اپنی اجرت میں بقدر مناسب اضافی کی کوشش نہ کرے، ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ چیزوں کے جنائے وہ صرف ناموں میں معاوضہ لے کر قناعت اختیار کرے۔پچھلی تمام تاریخ ثابت کرتی ہے کہ جب بھی نقد رقم کی قیمت گرنے کا موقع آتا ہے تو سرمایہ دار چوکنے ہو جاتے ہیں اور موقع سے فائدہ اٹھا کر محنت کرنے والوں کو فریب دئے رہتے ہیں۔سیاسی معاشیات کے ماہرین ک ایک بڑا مکتب فکر ایسا ہے جس کا کہنا ہے کہ سونے والی زمینوں کی نئی دریافتوں کی بدولت، چاندی کی کانوں میں کام کی آسانیوں، اور پارے کی سستی نکاسی کی بدولت قیمتی دھاتوں کی ویلیو پھر گر گئی ہے۔اس سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ یورپ میں ہر طرف اور ایک ساتھ کیوں آواز اٹھی ہے اجرتیں بڑھوانے کی۔

3۔اب تک عام طور سے م یہ فرض کرنے ائے ہیں کہ کام کا دن محدود ہوتا ہے۔کچھ بھی سہی کام کا دن بجائے خود مستقل حدوں کا پابند نہیں۔سرمائے کا مستقل رجحان یہی ہے کہ اسی حساب سے فالتو محنت لے گا اور اس سے حاصل ہونے والا منافع بھی اتنا ہی بڑھے گا۔کام کے دن کو لمبا کھینچنے میں سرمائے کو کس قدر کامیابی ہوگی اسی قدر وہ دوسروں کی محنت ہتھیا سکے گا۔سترہویں صدی میں، بلکہ اٹھارویں صدی کے پہلے دو تہائی حصوں میں بھی پورے انگلستان میں کام کے دس گھنٹے کا معمول تھا۔جیکو بین کے خلاف جنگ چھڑی جو دراصل برطانوی امیروں نے برطانیہ کے عام مزدوروں کے خلاف چھیڑی تھی (23) تو لڑائی کے پورے عرصے سرمائے نے خوب بغلیں بجائیں اور کام کا دن دس کے بجائے بارہ، چودہ اور اٹھارہ گھنٹے تک بڑھا دیا۔مالتھوس، جسے دور دور جذباتی رقت کا الزام نہیں دیا جا سکتا، 1815 کے شائع شدہ ایک پمفلٹ میں کہتا ہے کہ اگر یہی حالت چلتی رہی تو قوم کی زندگی کی خاص جڑ بنیاد پر چوٹ پڑے گی (24)۔نو ایجاد مشینری ابھی عام طور سے لگائی نہ گئی تھی کہ اس سے چند سال پہلے 1765 کے قریب انگلینڈ میں ایک پمفلٹ شائع ہوا جس کا عنوان تھا: "صنعت پر ایک مضمون"۔پمفلٹ کا بے نام مصنف، جو محنت کش طبقوں کا پکا دشمن ہے (غالبًا اس کا مصنف تھا جان کنگھم)۔، کھلے لفظوں میں زور دے کر کہتا ہے کہ محنت کے دن کی حدیں پھیلانا بے حد ضروری ہے۔اس مقصد سے اور باتوں کے علاوہ وہ ایک تجویز یہ بھی رکھتا ہے کہ محنت کے دن کی حدیں پھیلانا بے حد ضروری ہے۔اس مقصد سے اور باتوں کے علاوہ وہ ایک تجویز یہ بھی رکھتا ہے کہ محنت گھر (25) قائم کئے جائیں جو بقول اس کے "ہیبت گھر" ہونے چاہئیں۔ان "ہیبت گھروں" کے لئے محنت کے دن کی حدیں کیا ہوں گی؟ وہ بارہ گھنٹے کی تجویز کرتا ہے، یعنی ٹھیک اتنا وقت جتنا 1832 میں سرمایہ داروں، سیاسی معاشیات والوں اور وزیروں کے کہنے کے مطابق نہ صرف اس زمانے میں مقرر تھا بلکہ محنت کے لئے کم از کم

اتنا ضروری اور بارہ برس تک کی عمر کے بچے پر بھی لازم ہونا چاہئے۔

اپنی قوت محنت بیچ کر، موجودہ نظام میں اسے بیچنا تو ہے ہی، مزدور اس قوت کا استعمال سرمایہ دار کے سپرد کر دیتا ہے لیکن چند معقول حدوں کے اندر۔ وہ اپنی قوت محنت بیچتا ہے تا کہ اسے سنبھال سکے (قدرتی طور پر جتنی گھسائی ہوتی ہے فی الحال اس کا ہم حساب نہیں کرتے) لیکن وہ بالکل ہی برباد ہونے پائے۔ روز کی یا ہفتہ وار ویلیو کے حساب سے اپنی قوت محنت بیچنے میں یہ بات ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ ایک دن یا ایک ہفتے کے اندر وہ قوت محنت دو دن یا دو ہفتے کے برابر نہ تو خرچ کی جائے گی، نہ اتنی ضائع ہونے پائے گی کوئی مشین لیجئے جس کی قیمت ایک ہزار پونڈ ہے۔ اگر وہ دس سال کے استعمال سے ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہونی ہے تو جو مال اس سے بنایا جاتا ہے، اس مال میں ہر سال ایک سو پونڈ کی ویلیو کا اضافہ کرے گی۔ اور اگر اسے صرف پانچ سال کے استعمال میں ختم ہونا ہے تو سالانہ دو سو پونڈ کی ویلیو لگے گی، یا یوں کہیں کہ مشین کی سالانہ گھسائی کی ویلیو اتنے عرصے پر پھیلائی جاتی ہے جتنے عرصے میں وہ استعمال سے ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائے گی۔ مگر یہاں آدمی اور مشین مین فرق پڑتا ہے۔ مشین کی طاقت ٹھیک اسی نسبت سے ختم نہیں ہوتی جس سے اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف آدمی پر کام کے اوقات بڑھائے جاتے ہیں تو وہ دیکھنے میں جتنا تھکتا ہے، درحقیقت اس سے زیادہ ٹوٹتا یا گھل جاتا ہے۔

جب محنت کرنے والوں کی طرف سے یہ کوشش کی جائے کہ کام کے گھنٹے پہلے کی معقول حدوں تک کم ہوں، یا یہ کہ جب وہ کام کے گھنٹوں کے معمول پر قانونی حد نہیں لگوا سکتے تو اجرت بڑھوا کر کام کی زیادتی پر ایک روک لگانے کی کوشش کرتے ہیں، یعنی فالتو وقت میں جو ان سے کام لیا گیا اجرت اسی کی نسبت سے نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی بڑھائی جائے (یا اوور ٹائم کی اجرت نسبتاً زیادہ ہو) تو وہ صرف اپنی طرف سے اور اپنی نسل کی طرف سے ایک فرض ادا کرتے ہیں۔ محنت کرنے والے اس طرح صرف حدیں کھڑی کرتے ہیں سرمائے کے بے درد قبضہ مخالفانہ پر۔ وقت انسانی نشوونما کے لئے محض ایک گنجائش ہی تو ہے۔ جس آدمی کو فرصت کا وقت میسر نہ ہو، جس کی ساری عمر، سونے، کھانے وغیرہ کی جسمانی حاجتوں کو چھوڑ کر باقی تمام وقت سرمایہ دار کے لئے محنت کرنے میں کٹ جائے، وہ لداؤ جانور سے بھی بدتر زندگی گزارتا ہے۔ جسمانی لحاظ سے تھکا ہارا اور روحانی لحاظ سے بے حس، وہ ایک ایسی مشین رہ جاتا ہے جس سے غیر کی دولت ڈھالی جائے۔ پھر بھی موجودہ صنعت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ اگر سرمائے پر پابندی نہ لگائی جائے تو وہ بڑی بے پروائی اور بے رحمی کے ساتھ پورے محنت کش طبقے کو انتہائی پستی کی حالت پر پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔

کام کے گھنٹے بڑھانے میں سرمایہ دار زیادہ اجرت دیتے ہوئے بھی محنت کی ویلیو گرا سکتا ہے، اگر وہ اجرت، جو بڑھائی گئی ہے، محنت کی اس بڑھتی ہوئی مقدار سے، جو مزدور سے لی جاتی ہے، اور زیادہ محنت کی وجہ سے قوت محنت میں جو تیزی سے زوال آتا ہے، اس سے بھی میل نہ کھاتی ہو۔ ایک اور ترکیب بھی ہے۔ آپ کے یہ اعداد شمار نکالنے والے جو درمیانی طبقے

سے ہونے ہیں، بتائیں گے کہ مثلاً لنکا شائر میں فیکڑی کے ملازم خاندانوں کی اوسط اجرتیں بڑھ گئی ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جہاں پہلے صرف ایک آدمی یعنی خاندان کا بڑا کام کیا کرتا تھا، اب وہیں اس کی بیوی اور تین چار بچے بھی سرمائے کے جگن ناتھ کے رتھ کے نیچے (26 پسنے کو ڈال دئے گئے ہیں اور ان کی اجرت مل کر جتنی بڑھی ہے وہ اس فالتو محنت کے برابر نہیں آتی جو سارے خاندان سے ملا کر لی جاتی ہے۔

اگر کام کے گھنٹوں کی مقررہ حد بھی قائم رہے جیسا کہ آجکل صنعت کی ان تمام شاخوں میں ہے جو فیکڑی قانون کے ماتحت ہیں، تب بھی اجرت کا بڑھنا محنت کی ویلیو کی ادائیگی کا وہی پچھلا معیار قائم رکھنے کی خاطر ضروری ہو جاتا ہے۔ محنت کی شدت بڑھانے سے، یہ ممکن ہے کہ آدمی کو گھنٹے بھر کے وقت میں اتنی محنت خرچ کرنی پڑ جائے جتنی وہ پہلے دو گھنٹے میں کیا کرتا تھا۔ صنعت کی ان شاخوں میں جن پر فیکڑی کا قانون لاگو ہے، کسی حد تک یہ عمل ہو بھی چکا ہے اور وہ اس طرح کہ مشینری اور کام کی رفتار تیز کر کے ایک ایک آدمی کے ذمے زیادہ مشینوں کی دیکھ بھال کر دی گئی۔ اگر محنت کی شدت بڑھانے یا ایک گھنٹے میں جتنی محنت کھپتی ہے اسے بڑھانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کرتا کہ کام کے گھنٹوں کی مدت بجا طور پر کم کر دی جاتی تب بھی محنت کرنے والا کچھ فائدے میں رہتا ہے۔ اگر وقت محنت کی یہ حد ٹوٹتی ہے تو اس نے ایک شکل میں جو پایا وہ دوسری صورت میں کھو دیا، اور دس گھنٹے کی محنت اتنی ہی جان لیوا بن جائے گی جتنی بارہ گھنٹے کی محنت بنی ہوئے تھی۔ سرمائے کے اس رجحان پر روک لگانے میں جب مزدور کی طرف سے کوشش ہوتی ہے کہ محنت کی بڑھتی ہوئی شدت کے مطابق ہی اس کی اجرت بھی بڑھائی جائے تو وہ صرف اتنا کرتا ہے کہ اپنی محنت کی قیمت گرنے اور اپنی نسل پر زوال آنے کا توڑ کرے۔

4۔ آپ سب واقف ہیں کہ ایسی وجہوں سے جن کی تفصیل یہاں کچھ ضروری نہیں، سرمایہ دارانہ پیداوار تھوڑے تھوڑے وقفے سے بعض چکروں سے گزرتی رہتی ہے۔ ایک حالت امن چین کی ہوتی ہے، پھر بڑھتی ہوئی ہلچل، خوشکالی، ضرورت سے زیادہ پیداوار، بحران یا سنکٹ اور پھر جمود۔ مال کے بازار دام اور بازار کی شرح منافع کو بھی انھی دوروں سے گزرنا پڑتا ہے کہ کبھی اوسط سے گرے، کبھی بڑھ گئے۔ اگر اس پورے چکر پر نظر رکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ بازار دام اگر ایک طرف کو زیادہ ہٹتے ہیں تو پھر دوسری طرف ہٹ کر اپنا حساب برابر کر لیتے ہیں اور پورے چکر کا اوسط نکالا جائے تو مالوں کے بازار دام بالاخر اپنی ویلیو کے ہی پابند رہتے ہیں۔ اچھا تو بازار دام ڈوبنے کے دور میں، بحران اور جمود کے دنوں میں اگر محنت کرنے والے کو بالکل ہی بے روزگار نہ کر دیا جائے تو اس کی اجرت ضرور گھٹا دی جاتی ہے۔ دام گرتے وقت بھی، فریب سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ محنت کرنے والا سرمایہ دار سے مول تول کرے کہ اجرت گھٹایا جانا

ضروری ہے تو کس تناسب سے ضروری ہے۔ اور خوش حالی کے زمانے میں جب خاص کر زائد منافع بن رہا ہو، اگر وہ اپنی اجرت بڑھوانے کے لئے نہیں لڑے تو صنعتی رفتار کا ایک چکر پورا ہوتے ہوتے جو اوسط پڑے گا اس میں اوسط اجرت یا اپنی

محنت کی ویلیو بھی نصیب نہیں ہوگی۔حماقت کی انتہا ہوگی اگر یہ تقاضہ کیا جائے کہ صنعتی چکر کے برے دنون کا اجرت پر برا اثر تو ضرور ہی پڑے گا لیکن، جب اچھے دن ہوں، تو خوش فہمی میں رہنے سے مزدور خود کو علیحدہ ہی رکھے۔عموماً تمام مالوں کی قدریں صرف اسی طرح وصول ہوتی ہیں کہ مانگ اور سپلائی کی لگا تار اونچ نیچ ہوتے رہنے سے بازار دام اپنی کمی بیشی کا حساب برابر کرتے رہتے ہیں۔موجودہ نظام کے اصول سے محنت بھی اوروں کی طرح ایک مال ہے۔چنانچہ اسے بھی کمی بیشی سے گزرنا چاہئے تا کہ اپنی ویلیو کے مناسب اوسط قیمت حاصل کر سکے۔یہ ایک احمقانہ بات ہے کہ ایک طرف تو محنت کو ایک مال شمار کیا جائے اور دوسری طرف مال کی قیمتوں پر جو اصول لاگو ہوتے ہیں ان سے محنت کو الگ رکھا جائے۔غلام کو گزارا وقات کے لئے ایک مقررہ اور مستقل طلب ملتی رہتی لیکن اجرت پر کام کرنے والے کو نہیں ملتی۔پس لازم ہے کہ وہ ایک موقع پر انی اجرت بڑھوانے کی کوشش کرے تا کہ اور کچھ نہیں تو دوسرے موقع پر اجرت گھٹنے کی تلافی ہو جائے۔اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے اور سرمایہ دار کی مرضی اور حکم کو ہی مستقل معاشی قانون سمجھ کر قبول کر لے تو وہ غلاموں کی سی بدنصیبی کا شکار تو ہو جائے گا، غلام کی سی بے فکری اسے نصیب نہ ہوگی۔

5۔اب تک جتنی مثالیں میرے زیر غور آئی ہیں اور ان کی تعداد سو میں ننانوے ضرور ہے، آپ نے دیکھ لیا کہ اجرت بڑھوانے کی جدوجہد اپنے سے پہلے کی تبدیلیوں کی لپیٹ میں قدم بقدم چلتی ہے اور یہ خمیازہ ہے ان پہلے کی پیداواری طاقت میں، محنت کی ویلیو میں، روپے کی ویلیو میں، جو محنت لی جاتی ہے اس کی گنجائش یا شدت میں، قیمتوں کی اس اونچ نیچ میں جو منحصر ہے مانگ اور سپلائی کی کمی بیشی پر، اور صنعتی رفتار کے پورے چکر کے مختلف مرحلوں سے پوری مطابقت رکھتی ہے۔مختصر یہ کہ اجرت بڑھوانے کی مانگ لیبر کی جوابی کاروائی ہے سرمائے کی پہلے سے کی ہوئی کاروائی پر۔اس جدوجہد کو ان تمام حالات سے بے تعلق کر کے دیکھنا، صرف اجرت کی تبدیلی پر نظر رکھنا اور ان تمام تبدیلیوں سے نظر بچا جانا جن سے یہ تقاضہ پیدا ہوتا ہے، ایسا ہے کہ آپ ایک غلط مفروضے سے شروع کرتے ہیں تا کہ آخر میں غلط نتیجے پر پہنچ جائیں۔

14۔سرمائے اور محنت کی شکش اور اس کے نتیجے

1۔میں دکھا چکا ہوں کہ اجرت گھٹائے جانے کے خلاف مزدوروں کی طرف سے جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مقابلہ کیا جاتا ہے اور بار بار کوشش کی جاتی ہے کہ اجرت بڑھے، یہ بات اس اجرتی نظام کے ساتھ لازم ملزوم ہے اور خود اٹھتی بھی ہے اسی وجہ سے کہ محنت کو مال کا درجہ حاصل ہے، اس لئے وہی قاعدے جو قیمتوں کی عام رفتار پر حاوی رہتے ہیں، محنت بھی انھی کی پابند ہوتی ہے۔اس کے علاوہ یہ بھی دکھا چکا ہوں کہ اجرت میں عام اضافے کا اثر یہی ہوتا ہے کہ شرح منافع عام طور سے گھٹ جائے، پھر بھی اس سے مالوں کی اوسط قیمتوں پر یا ان کی قدروں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔تو آخر میں سوال یہ پیدا

ہوتا ہے کہ سرمائے اور محنت کی اس مسلسل کش مکش میں محنت کی کامیابی کے آثار کہاں تک ہیں۔

کلیے کی صورت میں تو یہ جواب دے سکتا ہوں اور کہہ سکتا ہوں کہ جیسا اور مالوں کا معاملہ ہے ویسا ہی محنت کا بھی ہے کہ اس کے بازار دام بھی ایک بڑے عرصے کے اندر اپنی ویلیو سے تال میل پیدا کریں گے۔ لہذا چاہے کتنے ہی نشیب و فراز آتے رہیں اور مزدور کچھ بھی کرے، اوسط میں اسے وہی وصول ہوگی جو اس کی محنت کی ویلیو یا جو اس کی قوت محنت کی ویلیو بنتی ہے، اور وہ طے پاتی ہے ان ضروریات کی ویلیو سے جو محنت کو قائم رکھنے اور پھر سے پیدا کرنے کے لئے لازم ہیں۔ یہ ضروریات زندگی کی ویلیو کم و بیش ہوتی رہتی ہے محنت کی اس مقدار سے جو ان چیزوں کے تیار کرنے میں لگتی ہے۔

لیکن بعض خصوصیات ایسی ہیں جو قوت محنت کی یا خود محنت کی ویلیو کو دوسرے تمام مالوں کی قدروں سے امتیاز بخشی ہیں۔ قوت محنت کی ویلیو دو عناصر سے بنتی ہے: ایک محض جسمانی، سوسرا تاریخی یا سماجی۔ اس کی سب سے نچلی حد تو جسمانی عنصر سے ہی بنتی ہے، یا یوں کہئے کہ اپنا وجود باقی رکھنے اور پھر سے پیدا کرنے کی خاطر، اپنے جسمانی وجود کو قائم و دائم رکھنے کی خاطر مزدور طبقے کو وہ ضروریات زندگی میسر ہونی چاہیں جو زندہ رہنے اور نسل بڑھانے کے لیے انتہائی لازمی ہوتی ہیں۔ چنانچہ انہی انتہائی لازمی ضروریات زندگی کی جو ویلیو ہوگی وہی محنت کی ویلیو کی کم از کم حد مقرر ہوگی۔ دوسری طرف دیکھئے تو کام کے دن کے پھیلاؤ پر بھی کوئی نہ کوئی آخری حد ضرور ہوتی ہے، چاہے اس میں کتنی ہی لوچ اور لچک ہو۔ محنت کرنے والے کی جسمانی طاقت ہی اس کی آخری حد بنا دیتی ہے۔ اگر اس کے بدن کی اصلی سکت روزانہ کی کسی حد سے زیادہ خرچ ہونے لگے تو ہر روز نئے سرے سے اتنی ہی نہیں کھپائی جا سکتی۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، اس حد میں بڑی لچک ہوتی ہے۔ اگر کمزور اور کم جینے والی نسلیں یکے بعد دیگرے جلدی جلدی آتی رہیں تو بھی لیبر کے بازار کو اسی طرح بھرا رکھیں گی جیسے مضبوط جسم کی اور زیادہ عمر پانے والی نسلوں کا سلسلہ رکھتا۔

اس جسمانی عنصر کے علاوہ محنت کی ویلیو ہر ایک ملک میں وہاں کے پہلے سے چلتے ہوتے معیار زندگی سے طے پاتی ہے۔ یہ صرف جسمانی زندگی کی بات نہیں، بلکہ ایسی ضروریات کا مہیا کرنا بھی شامل ہے کہ جن سماجی حالات میں لوگ پلتے بڑھتے ہیں یہ ضروریات بھی انہی سے ابھرتی ہیں۔ انگریز کا معیار زندگی آئرلینڈ کے معیار تک گھٹایا جا سکتا ہے۔ کسی جرمن کسان کا معیار زندگی لیوونیا والے کسان تک اتارا جا سکتا ہے۔ تاریخی رواج اور سماجی چلن اس سلسلے میں کتنی اہمیت رکھتے ہیں، یہ آپ مسٹر تھارن ٹن کی تصنیف ''حد سے زیادہ آبادی پر'' دیکھ کر اندازہ کر سکتے ہیں، جہاں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ انگلینڈ کے مختلف زراعتی ضلعوں میں آج بھی اوسط اجرت مختلف ہے۔ یہ ضلعے زمین سے بندھے (نیم غلام) کسان حالت سے نکل کر سدھار کے جس جس درجے میں پہنچ پاتے ہیں، اسی درجے کی کم و بیش نسبت سے ان کی اجرتوں میں فرق پڑتا ہے۔

یہ تاریخی یا سماجی عنصر جو محنت کی ویلیو میں دخیل ہوتا ہے، زیادہ پھیل بھی سکتا ہے، سکڑ بھی سکتا ہے، یہاں تک کہ بالکل

ناپید بھی ہوسکتا ہے کہ سوائے جسمانی حد کے اور کچھ نہ رہ جائے ۔جس زمانے میں جیکو بی کے خلاف جنگ چل رہی تھی (بڑے میں جارج روز ، جو ٹیکس ہضم کرنے کے پرانے پاپی اور مفت کی تنخواہ پانے کے عادی (Sinecurist) تھے اس جنگ کا مقصد یوں بتایا کرتے تھے کہ یہ ہمارے مقدس مذہب کی خوبیوں کو فرانسیسی بے دینوں کی دست برد سے بچانے کی خاطر ہے) ان دنوں دیندار انگریز کا شتکار نے ، جس کا ذکر خیر ہم پہلے کسی موقع پر کر چکے ہیں ، زرعی مزدوروں کی اجرتیں گھٹاتے گھٹاتے اتنی کر دیں تھیں کہ خالص جسمانی احتیاج کو بھی کم پڑنے لگیں ، اور وہ ضرورت جو نسل کو باقی اور جاری رکھنے کیلئے درکار تھیں ، ان کی کمی پوری کی جاتی اس فنڈ سے جو'' قانون مفلسی'' (27) کی رو سے مقرر تھا۔ یہ شاندار ترکیب اس مقصد کے لئے تھی کہ اجرت پر کام کرنے والے کو غلام بنا کر اور شیکسپئر کے پیش کئے ہوئے بانکے کو مفلس قلاش بنا کر رکھ دیا جائے۔

اگر آپ مختلف ملکوں میں یا کسی ایک ہی ملک کے مختلف تاریخی دوروں میں اجرتوں کے معیار یا محنت کی قدروں کا موازنہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ خود محنت کی ویلیو بھی کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ جس وقت اور دوسرے مالوں کی قدریں ایک حالت پر قائم ہوں تب بھی محنت کی ویلیو برابر گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

اس طرح کا موازنہ کرنے سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ منافع کے صرف بازار بھاؤ ہی نہیں ملتے بلکہ اس کا اوسط بھاؤ بھی بدل جاتا ہے

تاہم منافع کے معاملے میں کوئی ایسا اصول یا قاعدہ نہیں جو اس کی کم از کم حد مقرر کرتا ہو۔ کہا نہیں جا سکتا کہ منافع آخر میں کہاں تک اتر سکتا ہے۔ یہ حد مقرر کیوں نہیں جا سکتی ؟ کیوں کہ اجرت کم از کم حد تو مقرر کر دی جائے لیکن اس کی زیادہ سے زیادہ حد نہیں ٹھیرائی جا سکتی ۔ ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ کام گھنٹے دئے ہوئے ہوں تو زیادہ سے زیادہ منافع ٹھیرے گا جہاں اجرت کی کم از کم جسمانی سطح ہوگی ، اور اجرتیں دی ہوئی ہوں تو زیادہ سے زیادہ منافع کام کے گھنٹوں کی اس گنجائش سے میل کھائے گا جسے مزدور کی جسمانی طاقت سہار سکے۔ مطلب یہ کہ زیادہ سے زیادہ منافع ان حدوں کے درمیان پہنچ کر ٹھیرتا ہے جہاں اجرتیں کم از کم اتری ہوئی ہوں (Physical minimum of wages) اور کام کے گھنٹے زیادہ سے زیادہ بڑھے ہوتے ہوں (Physical maximum of the working days) ۔ظاہر بات ہے کہ زیادہ سے زیادہ شرح منافع کی ان دو حدوں کے درمیان اونچ نیچ کی بے پناہ صورتیں بھی ممکن ہیں۔ واقعی کس درجے پر لا کر منافع ٹھہرایا جائے ، یہ طے پاتا ہے صرف اس کش مکش سے جو محنت اور سرمائے کے درمیان مستقل چلتی رہتی ہے۔ سرمایہ دار برابر اس کوشش میں رہتا ہے کہ اجرتیں گھٹا کر سب سے نیچی جسمانی سطح پر لائی جائیں اور کام کے گھنٹے بڑھا کر سب سے اوپر کی جسمانی سطح تک پہنچائے جائیں ، اس پر محنت کرنے والا لگاتار مخالف سمت میں زور ڈالتا رہتا ہے۔

آخر یہ معاملہ حریفوں کی زور آزمائی کا ایک سوال بن کر رہ جاتا ہے۔

2- جہاں تک کام کے گھنٹوں کی حد بندی کا مسئلہ ھے، وہ انگلینڈ میں ہوں یا دوسرے ملکوں میں، کبھی طے نہیں ہو سکا سوائے اس کے کہ قانون سازی نے دخل دے کر طے کرایا۔ اگر مزدور باہر سے برابر دباؤ نہ ڈالتے رہتے تو قانون بھی کبھی دخل دینے پر آمادہ نہ ہوتا۔ اور جو بھی ہوتا لیکن اس نتیجے پر کبھی نہیں پہنچا جا سکتا تھا کہ محنت کرنے والے اور سرمایہ دار آپس میں نبٹ لیں اور کام کے گھنٹوں کی حد بندی طے کر لیں۔ عام سیاسی کاروائی کی ضرورت پڑنا خود ہی ثبوت دیتا ہے کہ اگر معاملہ صرف معاشی کاروائی کا ہو تو سرمایہ زیادہ مضبوط فریق ہے۔

رہا محنت کی ویلیو کی حدوں کا سوال تو اس کا صحیح فیصلہ صرف مانگ اور سپلائی پر منحصر رہتا ھے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ سرمائے کی طرف سے لیبر کی مانگ اور محنت کرنے والوں کی طرف سے لیبر کی سپلائی۔ جن ملکوں میں نوآبادیات بسی ہیں وہاں سپلائی اور مانگ کا اصول مزدور کے حق میں جاتا ہے۔ اسی لئے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اجرتوں کا معیار اوروں سے اونچا ہے۔ سرمایہ وہاں سارے جتن کرتا ہے لیکن لیبر کے بازار کو بار بار خالی ہونے سے نہیں روک پاتا کیوں کہ اجرت پر کام کرنے والے برابر مزدوری چھوڑ کر آزادانہ اور خود کفایتی کاشتکار بنتے رہتے ھیں۔ امریکہ والوں میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو مزدوری صرف پاؤں ٹکانے کے لئے کرتے ہیں جسے تھوڑے بہت عرصے بعد بہر حال چھوڑنا ہی ہے۔ نوآبادی میں حالت کے اس بگاڑ کو سنبھالنے کے لئے برطانیہ کی مربیانہ حکومت نے کچھ زمانے کے لئے وہ برتاؤ اختیار کر لیا جسے آج کل کا نوآبادی بسانے کا نظریہ کہتے ہیں۔ اس نظریے کا حاصل یہ کہ نوآبادیات کی زمین کی قیمت خواہ مخواہ بہت بڑھا چڑھا کر رکھی جائے تا کہ مزدور تیزی کے ساتھ آزاد کاشتکار نہ بن بیٹھے۔

اب ذرا پرانے متمدن ملکوں کو لیجئے جہاں پیداوار کے پورے سلسلہ عمل پر سرمایہ حاوی ہو چکا ہے۔ مثال کے طور پر انگلینڈ میں زرعی مزدوریاں 1849 سے 1859 تک کی مدت میں کتنی بڑی ہیں؟ اور نہ اس کے بازار دام۔ ہمارے دوست ویسٹن صاحب بھی انہیں شائد یہی موسرہ دیتے۔ الٹا ہوا یہ کہ قیمتیں گرنے پر انہیں راضی ہونا پڑا۔ یہی مشورہ دیتے۔ الٹا ہوا یہ کہ قیمتیں گرنے پر انہیں راضی ہونا پڑا۔ لیکن ان گیارہ برسوں میں انہوں نے ہر قسم کی مشین لگا دی، زیادہ سائنسی طریقے اپنا لئے، قابل کاشت زمینوں کا ایک حصہ چراگاہوں میں بدل دیا، کھیتوں کے سائز بڑھا دئے اور اسی سے پیداوار کا پیمانہ بڑا کر لیا۔ ان تدبیروں کے علاوہ اور ایسے راستے اختیار کر کے، جن سے لیبر کی قوت پیداوار بڑھا کر اس کی مانگ میں برابر تخفیف کی جا سکے، انہوں نے زرعی آبادی کو پھر اتنا کر لیا کہ وہ بسبتاً ضرورت سے زیادہ ہی رہے۔ یہ ہے وہ عام طریقہ جس سے پرانے جمے جمائے ملکوں میں اجرتیں بڑھنے کے مقابلے پر سرمایہ ذرا آہستہ یا تیز جوابی کاروائی کرتا ہے۔ ریکارڈو نے سچ کہا تھا کہ مشین کا لیبر سے مستقل مقابلہ چلتا رہتا ہے اور اکثر مشینیں تبھی لگائی جاتی

ہیں جب محنت کی قیمت بڑھ کر ایک حد کو پہنچ چکی ہو۔(28)۔لیکن مشین لگانا محنت کی پیداواری قوت بڑھانے کی قوربہت ساری تدبیروں سے صرف ایک تدبیر ہے۔یہی ایک قدم جو عام محنت کو نسبتاً فالتو بناڈالتا ہے، یہی دوسری طرف ہنرمندلیبت کو سادہ محنت میں بدل کر اس کی قدر و قیمت بھی گرادیتا ہے۔

یہی قانون دوسری صورت میں بھی سامنے آتا ہے۔محنت کی پیداواری طاقت بڑھنے سے، چاہے اجرت کا میعار کچھ زیادہ ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی سرمایہ جمع ہونے کی رفتار تیز ہوجاتی ہے۔یہاں سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے،جیسا کہ آدم سمتھ نے جس کے زمانے مین جدید صنعت ابھی ہاتھ پاؤں نکال رہی تھی،نتیجہ نکالا کہ سرمائے کا تیزی سے جمع ہونا مزدور کے حق میں فیصلہ کرے گا کیونکہ اس کی محنت کی مانگ بڑھتی جائے گی۔اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں تو آج کل کے بہت سے اہل قلم حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ اگرچہ پچھلے بیس سال کے اندر انگریزی سرمایہ انگریزی آبادی کے مقابلے میں کہیں تیزی سے بڑھا ہے لیکن اجرتوں میں ایسا خاص اضافہ نہیں ہوا۔کیوں؟ اس لئے کہ سرمائے کا ذخیرہ ہونا جوں جوں بڑھتا ہے اس کے ساھت سرمائے کی اندرونی ترکیب بھی رفتہ رفتہ بدلتی جاتی ہے۔مجموعی سرمائے کا وہ حصہ جو قائم سرمائے میں یعنی مشینری، کچے مال اور ہرممکن صورت کے ذرائع پیداوار میں لگایا جاتا ہے، وہ درجہ بدرجہ بڑھتا جاتا ہے، بمقابلہ اس حصے کے جو اجرتوں میں یا محنت کی خریداری میں پھیلایا جاتا ہے۔یہ قانون تھوڑے بہت نپے تلے انداز میں مسٹر بارٹن، ریکارڈو، سسماندی، پروفیسر رچرڈ جونسن، پروفیسر ریمزے،شربولئے اور دوسرے حضرات نے بیان کردیا ہے۔

اگر سرمائے کے ان دونوں اجزا کی نسبت شروع میں ایک اور ایک تھی تو صنعت کی ترقی میں اب یہ نسبت پانچ اور ایک کی ہوجاتی ہے، اور اسی طرح آگے بھی۔اگر مجموعی سرمایہ چھ سو لگا ہے اور اس مین تین سو اوزاروں میں، کچے مال وغیرہ میں اور تین سو اجرتوں پر پھیلا ہوا ہے تو مجموعی سرمائے کے صرف دوگنا ہونے کی دیر ہے کہ تین سو کی بجائے چھ سو محنت کرنے والوں کی ضرورت پڑے گی۔لیکن اگر چھ سو کے مجموعی سرمائے میں پانچ سو مشین میں، کچے مال اور دوسری چیزوں میں لگا ہے اور صرف سو اجرتوں پر پھیلا ہوا ہے تو سرمائے کو چھ سو سے بڑھ کر تین ہزار چھ سو پر پہنچنا چاہئے تب جا کر تین سو کی بجائے چھ سو محنت کرنے والوں کی مانگ ہوگی۔لہٰذا صنعت کی ترقی میں لیبر کی مانگ سرمائے کے جمع ہونے کے ساتھ ساتھ قدم نہیں بڑھاتی ہے۔یہ مانگ بڑھے گی تو ضرور،لیکن سرمائے کے بڑھنے کی رفتار سے برابر اس کا تناسب کم ہوتا جائے گا۔

یہ چند اشارے اتنا دکھانے کو کافی ہیں کہ جدید صنعت کا بڑھنا ہی رفتہ رفتہ محنت کرنے والے کے مقابلے میں سرمایہ دار کا پلہ بھاری کرتا جاتا ہے اور نتیجے میں سرمایہ داری پیداوار کا عام رجحان یہ نہیں ہوتا کہ اجرت کا اوسط میعار بلن کیا جائے بلکہ یہ میعار تہہ میں اتار دیا جائے، یا محنت کی ویلیو کم وبیش وہیں پہنچائی جائے جہاں اس کی سب سے نیچی حد ہو۔جب اس نظام کے ہوتے چیزوں کا جھکاؤ یوں ہو تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مزدور طبقے کو چاہئے کہ وہ سرمائے کی دست درازی کا مقابلہ کرنا

چھوڑ دے اور اپنی عارضی بہتری کا جو اتفاقی موقع ہاتھ آتا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوششوں سے منہ پھیر لے؟ اگر محنت کش ایسا کرنے لگیں تو وہ بے بسی اور بے کسی کا ایک انبوہ کثیر ہو کر رہ جائیں گے جس کے سامنے نجات کی کوئی راہ نہ ہو۔ امید ہے کہ میں اب تک یہ دکھا چکا ہوں کہ اجرت کے میعار کی خاطر محنت کشوں کی جدوجہد ایسا فعل ہے جسے اجرتوں کے نظام زندگی سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، سو میں سے ننانوے واقعات ایسے ہوتے ہیں جب اجرت بڑھ جانے کے لئے ان کی کوششیں دراصل صرف اس لئے ہوتی ہیں کہ محنت کی مقررہ ویلیو سنبھلی رہے اور یہ کہ سرمایہ دار سے اپنا مول تول کرنے کی ضرورت ان کی اس حالت کی رگ رگ میں بھری ہے جو حالت بکاؤ مال کی طرح ان سے اپنے آپ کو بکواتی ہے۔ اگرچہ بے ہمتی کے مارے سرمائے کے ساتھ اپنے روزانہ کے ٹکراؤ سے منہ موڑ لیں تو پھر ان میں اتنی سکت ہی نہ رہ جائے گی کہ کسی بڑی وسیع تحریک لے کر پہل کر سکیں۔

اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اجرت پر کام کرنے کا یہ نظام جو محنت کشوں کو عام طور سے دبا کر رکھتا ہے، اس سے قطع نظر، مزدور طبقے کو چاہئے کہ وہ آئے دن کے ان مقابلوں کے آخری انجام کو بہت بڑھا چڑھا کر نہ دیکھے۔ اسے یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ابھی لڑائی صرف اثرات سے چل رہی ہے، ان اثرات کی جڑ میں جو اسباب ہیں، ان سے نہیں چل رہی، وہ نشیب کی طرف ڈھلان کو روک رہی ہے، لیکن اس کی پوری سمت نہیں بدل رہی، وہ صرف بیماری کو تھامنے کی کوشش میں ہے، اس کا علاج کرنے میں نہیں۔ لہٰذا سرمائے کی انتھک دست درازی کی وجہ سے بازار کی تبدیلیوں کے باعث جو یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر بار اسے چار و ناچار چھاپہ مار لڑائی لڑنا پڑتی ہے، اسی میں ڈوب کر نہ رہ جائے۔ اسے یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ موجودہ نظام محنت کشوں پر چاہے کتنی ہی مصیبتیں نازل کر لے لیکن ساتھ ساتھ ایسے مادی حالات اور سماجی صورتوں کو بھی جنم دیتا ہے جو پورے سماج کی معاشی کایا پلٹ کرنے کے لئے لازمی ہیں۔ قدامت پسندی کے اس کلمے کی بجائے کہ "ایمانداری کی محنت کے دن کے بدلے ایمانداری کی مزدوری!" انہیں اپنے پرچم پر یہ انقلابی پلول چڑھا لینی چاہئے کہ "مزدوری پر کام کا نظام مردہ باد!"

اس طول طویل، بلکہ تھکا ڈالنے والے تفصیلی بیان کے بعد، جو مجھے بنیادی سوال پر روشنی ڈالنے کی خاطر مجبوراً دینا پڑا اب میں تقریر ختم کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کرتا ہوں:

1۔ اجرتوں کی شرح کا عام اضافہ عام شرح منافع کم کرنے کا سبب بنتا ہے۔ لیکن یوں دیکھئے تو مالوں کی قیمتوں پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔

2۔ سرمایہ داری پیداوار کا عام رجحان یہی ہے کہ اجرت کا اوسط میعار بڑھائے نہیں بلکہ تہہ تک اتار دے۔

3۔ ٹریڈ یونینیں سرمائے کی دست درازی سے ٹکر لینے کا مرکز بن کر مفید کام انجام دیتی ہیں۔ لیکن وہ اپنی طاقت کا صحیح استعمال

نہ کر کے جزوی طور پر نقصان اٹھاتی ہیں۔ عام طور سے ان کی ناکامی اس میں ہے کہ موجودہ نظام کے اثرات کا مقابلہ کرنے میں خود کو صرف چھاپہ مار لڑائی تک محدود کر لیتی ہیں، بجائے اس کے کہ ساتھ ساتھ اس نظام کو بدلنے کی کوشش کی جائے، اپنی منظّم طاقتوں سے کام لے کر انہیں مزدور طبقے کی آخری رہائی کے لئے یعنی مزدوری پر کام کرنے کے اس نظام کے بالکل خاتمے کے لئے اصلی پرزہ بنالیا جائے۔

مارکس نے آخر مئی اور 27 جون 1860 کے درمیان تحریر کیا۔

نوٹس

Notes

1۔ **سیاسی معاشیات (پولیٹکل اکانومی) کی تنقید** پر کارل مارکس کی تصنیف مارکسی سیاسی معاشیات کے وجود میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب پر قلم اٹھانے سے پہلے مارکس نے پندرہ سال تحقیق اور تلاش میں بسر کئے، بے شمار ادب چھان مارا، تب جا کے وہ اپنے معاشی نظریے کا خاکہ تیار کرنے قابل ہوا۔ شروع میں نیت یہ تھی کہ اپنے تحقیقات کے نتیجے ایک اسی جامع تصریف مین پیش کر دے جو خاص اسی مضمون سے متعلق ہو۔ اگست 1807 میں اس نے اپنے علم ذخیرے کو ترتیب دینا اور پہلا کچا خاکہ پھیلانا شروع کیا۔ چند مہینے گزرے ہوں گے کہ مارکس نے مفصل پلان تیار کر لیا اور فیصلہ کیا کہ اپنی تصنیف الگ الگ اشاعتوں کی صورت میں حصے کر کے شائع کر دے۔ چناچہ برلن کے ایک پبلشر ڈنکر سے ایک ابتدائی معاہدہ کر کے اس نے پہلے مضمون پر کام کا بیڑا اٹھایا اور یہ کتاب جون 1809 میں شائع بھی ہوگئی۔

پہلی اشاعت کے فوراً بعد مارکس نے دوسری کی تیارے کی، جس میں سرمائے کے مسائل سے بحث ہونی تھی۔ لیکن آگے کے مطالعے نے مصنف کو اپنے پہلے والا ارادہ بدل ڈالنے کی راہ سجھائی۔ اب صورت یہ بنی کہ الگ الگ کتاب لکھنے کے بجائے مارکس نے کتاب "سرمایہ" (Capital) لکھ دی جس میں اپنی کتاب "سیاسی معاشیات کی تنقید پر" کے خاص خاص خیالات بھی نظر ثانی کے بعد شامل کر لئے۔

2۔ یہاں اشارہ ہے اس نامکمل "دیباچہ" کی طرف جو مارکس نے سوچا تھا کہ معاشیات پر اپنے جامع تصنیف کے شروع میں دے گا۔

3۔ Rheinische Zeitung fur Politik, Handel und Gewerbe (سیاست، تجارت اور صنعت کے مسائل پر رائنی اخبار")۔ یہ ایک روزنامہ تھا جو پہلی جنوری 1842 سے 31 مارچ 1843 تک کولون سے

مارکس نے اس اخبار میں لکھنا شروع کیا اور اکتوبر میں وہ بھی اس کے اڈیٹروں میں شامل ہو گیا۔

4۔Allgemeine Zeitung (عام اخبار) یہ ایک رجعت پرست روزنامہ تھا جو 1798 سے شائع ہوا، 1810 سے 1882 تک وہ آگس برگ کے مقام سے چھپتا رہا۔ 1842 میں اس نے ایک مضمون میں یوٹوپیائی (قیاسی) کمیونزم اور سوشلزم کے خیالات توڑ مروڑ کر چھاپے۔ مارکس نے اپنے مضمون " کمیونزم اور آگس برگ Allgemeine " Zeitung میں اس بدعنوانی کا کچا چٹھا پیش کر دیا۔

5۔Deutsch.Franzosische Jahrbucher (جرمن فرانسیسی سال نامہ) پیرس سے جرمن زبان میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی۔ کارل مارکس اور آرنلڈ روگے اس کے اڈیٹر تھے۔ فروری 1844 میں اس کی ایک ڈبل اشاعت نکلی جس میں مارکس اور اینگلس کی وہ تحریریں شامل تھیں جن تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں مادیت کے فلسفے اور کمیونزم کے نظریے کی طرف کوچ کرنے کو تیار ہو چکے ہیں۔ سالنامہ اس کے بعد نہیں نکلا اور بڑی وجہ یہ کہ مارکس کے خیالات نے بورژوا ریڈیکل روگے کے خیالات سے میل نہیں کھایا اور اختلاف نے اشاعت روک دی۔

6۔ جرمن ورکرز سوسائٹی کے بنیاد مارکس اور اینگلز نے اگست 1847 میں بروسیلز میں اس نیت سے رکھی تھی کہ بلجیم میں جو جرمن ورکر بستے ہیں، ان کی سیاسی تعلیم ہو اور ان میں سائنسی کمیونزم کے خیالات کا پرچار کیا جائے۔ ان دونوں رہنماؤں اور ان کے حامیوں کی سرپرستی میں یہ سوسائٹی بلجیم میں جرمن انقلابی پرولتاریہ کو جوڑنے کا ایک قانونی مرکز بن گئی۔ اس کے بہترین کارکن بروسیلز میں کمیونسٹوں کی لیگ میں شامل ہو گئے۔ فروری 1848 میں جب فرانس کا انقلاب برپا ہوا تو بلجیم کی پولیس نے اس سوسائٹی کے ممبروں کو جلاوطن کر دیا اور یوں بروسیلز میں اس جماعت کی سرگرمیاں بکھر کر رہ گئیں۔

7۔ یہاں اشارہ ہے فروری 1848 کے اس انقلاب کی طرف جو فرانس میں برپا ہوا تھا۔

8۔Neue Rheinische Zeitung. Organ der Demokratie (نیا رائنی اخبار۔ ڈیموکریسی کا ترجمان) جرمن زبان کا روزنامہ تھا جو کولون شہر سے مارکس کی ایڈیٹری میں پہلی جون 1848 سے 19 مئی 1849 تک نکلتا رہا۔ اس کی ادارت میں مارکس کے ساتھ اینگلز بھی شریک تھا۔

9۔The New York Daily Tribune یہ ایک ترقی پسند بورژوا روزنامہ تھا جو 1841 سے 1924 تک برابر شائع ہوتا رہا۔ مارکس اور اینگلز نے اس کے کالموں میں اگست 1801 سے مارچ 1862 تک لکھا۔

10۔ پہلی انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا اجلاس جون 1860 لندن میں ہوا تھا جہاں مارکس نے یہ مقالہ اپنی تقریر کی صورت میں پڑھا تھا مارکس نے پہلی بار اس موقع پر قدر زائد (surplus value) کے اپنے نظریے کی بنیاد مجمع عام میں پیش کی۔ اگرچہ اس مقالے کا روئے سخن انٹرنیشنل کے ایک ممبر جان وسٹن کی طرف ہے، جس کا کہنا تھا کہ اجرتیں بڑھوانے سے

مزدوروں کی حالت بہتر نہیں ہوسکتی لہٰذا ٹریڈ یونین سرگرمی کو ورکرز کے مفاد کے خلاف سمجھنا چاہیئے، لیکن ساتھ ہی اس مقالے سے مارکس نے پرودھوں اور لاسال، دونوں کے نظریات پر بھی سخت ضرب لگائی، جنہیں مزدوروں کی معاشی جدوجہد اور ٹریڈ یونینوں کی سرگرمی ناگوار تھی۔ مارکس نے یہاں اس بات کی ڈٹ کر مخالفت کی ہے کہ مزدوروں کو سرمائے کی لوٹ کھسوٹ کے سامنے بے بسی اور فرمانبرداری سکھائی جائے، وہ نظریے کی بنیاد تیار کر کے بتاتے ہیں کہ مزدوروں کی معاشی جدوجہد کی کیا اہمیت ہے، اس کا کیا رخ ہے اور کیسے اس لڑائی کو پرولتاریوں کے اس مقصد کی پابندی کرنی اور اس منزل کی لگن رہنی چاہیئے کہ اجرتی محنت (مزدوری) کے اس نام کا ہی صفایا کر دیا جائے۔ اس تقریر کی اصل عبارت مارکس کے مسودوں میں محفوظ رہ گئی۔ پہلی بار 1898 میں لندن میں مارکس کی بیٹی ایلیونور انے "قدر" قیمت اور منافع" کے عنوان اور اپنے شوہر انگریزی سوشلسٹ ایڈورڈ ایویلینگ کے دیباچے کے ساتھ یہ مقالہ شائع کرایا۔ مارکس کے مسودے میں تعارف اور شروع کے چھ بابوں کا کوئی عنوان نہیں تھا۔ ایویلینگ نے ان پر عنوان لگائے اور یہاں جس صورت میں شائع کیا جا رہا ہے بعینہ اصل کے مطابق ہے، سوائے اس کے کہ مضمون کا نام بدل دیا گیا۔

11۔ انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن (پہلی انٹرنیشنل) یہ پرولتاریوں کی پہلی بین اقوامی جماعت تھی جس کی رہنمائی مارکس اور اینگلس کر رہے تھے (1876-1864) اس جماعت نے بڑے بڑے سرمایہ دار ملکوں کے ترقی یافتہ مزدوروں میں سائنسی سوشلزم کے خیالات پھیلائے اور (لینن کے الفاظ میں) " محنت کشوں کی بین اقوامی انجمن کی بنیاد ڈالی تاکہ سرمائے پر انقلابی حملے کی تیاری کی جائے"۔ اس انٹرنیشنل کا تفصیلی بیان دیکھنا ہو تو ملاحظہ کیجئے اینگلز کا وہ دیباچہ جو اس نے " کمیونسٹ پارٹی کے مینی فسٹو" کے جرمن ایڈیشن 1890 پر لکھا ہے اور مارکس کا وہ خط، جو اس نے 23 نومبر 1871 کو بولٹے کے نام بھیجا تھا۔

12۔ محنت کشون نے کام کے دن پر دس گھنٹے روز کی قانونی پابندی لگوانے کے لئے 18 ریں صدی کے آخر میں اور پھر 1830 کے بعد کے برسوں میں جو جدوجہد انگلینڈ میں چھیڑی اس نے پرولتاریوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چناچہ 8 جون 1847 کو برطانوی پارلیمنٹ نے بچوں اور عورتوں کے حق میں دس گھنٹے کی پابندی منظور کر لی۔ قانون منظور ہونے پر بھی بہت سے مالکان کارخانہ نے اس پر ایک عرصے تک عمل نہیں کیا۔

13۔ فرنس بورژوا انقلاب 94۔ 1793 کے زمانے میں جیکو بین کنونشن نے ایک قاعدہ بنایا جس کے مطابق بازار کے بعض سامانوں پر قیمتوں کا کنٹرول کر دیا گیا اور اسی کے ساتھ اجرتوں کی بھی اونچی سے اونچی حد مقرر کر دی گئی۔

14۔ سائنس کی ترقیوں کی برطانوی سوسائٹی 1831 میں بنی تھی اور آج تک چل رہی ہے۔ مارکس نے یہاں ایک تقریر کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس سوسائٹی کے معاشی بازو کے اجلاس منعقدہ ستمبر 1861، میں ایک شخص ڈبلیو۔ نیومین

(نیو مارچ) نے کی تھی (مارکس نے نام لکھنے میں ذرا سی غلطی کی ہے)۔

15۔ ملاحظہ رابرٹ اووین کے کتاب " کارخانہ داری نظام کے اثر پر کچھ مشاہدے "R. Owen Observations on the Effects of the Manufacturing System.London,1817.

16۔ جنگ کرائمیا کا حوالہ آیا ہے جو 1803 سے 1806 تک چلی۔

17۔ پچھلی صدی کے وسط میں دیہاتی علاقوں کے بہت سارے رہائشی مکان ڈھادئے گئے۔ اس کی وجہ یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ جاگیرداروں سے جو ٹیکس غریبوں کی بھلائی کے لئے وصول کیا جاتا تھا، وہ بڑی حد تک غریبوں کی اس تعداد کے حساب سے ہوتا تھا جو ان کی زمین جائداد پر آباد ہو۔ جاگیرداروں نے ایسے مکانات، جن کی ضرورت نہ رہ گئی تھی، مگر جن میں دیہات کی زائد آبادی سر چھپانے کی جگہ پاتی تھی، جان بوجھ کر مسمار کرادئے۔

18۔ سوسائٹی آف آرٹس (Society of Arts)۔ یہ ایک بورژوا تعلیمی اور رفاہ عام کی سوسائٹی تھی جو لندن میں 1854 میں قائم کی گئی۔ یہاں جس تقریر کا حوالہ آیا ہے وہ جان مارٹن کے صاحبزادے جان چارلس مارٹن نے پڑھی ہے۔

19۔ اناج کے قانون کے نام سے انگلینڈ نے قانون بنایا تھا تاکہ باہر ملکوں سے اناج کی درآمد پر پابندی لگائی جائے اور ملکی جاگیرداروں کے مفاد کی حفاظت کی جائے۔ 1838 میں مانچسٹر کے مل مالکوں کوبڈین اور برائٹ نے ایک انجمن بنائی "اینٹی کورن لیگ " کے نام سے، مقصد یہ کہ کھلی تجارت کے مطالبے پر زور دیا جائے۔ اس لیگ نے "اناج کے قانون " کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا تاکہ ایک طرف مزدوروں کی اجرت گھٹائی جائے، دوسری طرف جاگیرداروں کی معاشی اور سیاسی حیثیت گرائی جائے۔ چنانچہ 1846 میں یہ قانون منسوخ کر دیا گیا جس کے معنی تھے کہ صنعتی بورژوازی نے صاحب جائیداد طبقے پر فتح پائی۔

20۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی خانہ جنگی (65-1861) اس میں ایک جانب شمال کی صنعتی ریاستیں تھیں اور دوسری جانب جنوب کی غلاموں سے محنت لینے والے شورش پسندوں کی ریاستیں۔ انگلینڈ کے مزدور طبقے نے اپنے یہاں کے سرمایہ داروں کے خلاف آواز بلند کی جن کی پالیسی یہ تھی کہ غلاموں والے فریق کی مدد کی جائے۔ مزدور طبقے نے انگلینڈ کو اس خانہ جنگی میں دخل دینے سے روکا۔

21۔Physiocrats۔ فرانس مین اٹھارویں صدی کے وسط میں بورژوا سیاسی معاشیات میں یہ ایک رجحان چلا تھا۔ اس رجحان کے حامی بڑی سختی سے اس بات کے حق میں تھے کہ بڑے پیمانے پر سرمایہ دارانہ زراعت ہونی چاہئے، بعض طبقوں کو جو خاص حقوق حاصل ہیں، ان کا خاتمہ اور حفاظتی محصولات کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ ان لوگوں کو جاگیرداری نظام کے خاتمے کی ضرورت کا پورا احساس تھا لیکن پرامن اصلاحات کے ذریعے اس طرح یہ عمل کرنا چاہتے تھے جس سے حکمراں طبقے

اور مطلق العنانی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔فزیوکریٹوں کے فلسفیانہ خیالات تقریباً ویسے ہی تھے جیسے اٹھارویں صدی کے فرانسیسی روشن خیال اہل علم کے۔اس صدی کے آخر میں جب انقلاب فرانس برپا ہوا تو ان لوگوں کی تجویز کی ہوئی اکثر معاشی اصلاحوں کو عملی جامہ پہنا دیا گیا۔

22۔آدم اسمتھ کی تصنیف "فطرت اور قوموں کی دولت کے اسباب کی تحقیق (A.Smith An Inquity into the Nature and Causes of the Wealth of Nations.)

23۔اٹھارویں صدی کے آخر میں انقلاب فرانس کے زمانے میں انگلینڈ نے فرانس سے جو جنگیں لڑی تھیں، ان کی طرف اشارہ ہے۔ان دنوں انگلینڈ میں حکومت نے دہشت کا دور دورہ کر رکھا تھا تا کہ محنت کشوں کی زباں بندی کی جائے، خاص کر عوامی شورشوں کو بے رحمی سے کچلا گیا اور مزدور یونینوں کی ممانعت کے قانون بنائے گئے۔

24۔مارکس نے یہاں مالتھوس کے اس مشہور پمفلٹ کا حوالہ دیا ہے: "لگان کی فطرت، اس کے بڑھنے کی اور ان اصولوں کی تحقیق، جو لگان کے قانون طے کرتے ہے" (Malthus An Inquiry into the Nature and Progress of Rent , and the Principles by Which it is regulated. London,)

25۔"محنت گھر" سترھویں صدی کے انگلینڈ میں بنائے گئے تھے۔1834 میں جب "قانون مفلسی" جاری ہوئے تو پھر یہ محنت گھر صرف خیرات گھر رہ گئے۔ان کے قاعدے قانون جیلوں کی طرح اتنے کڑے تھے کہ بعد میں لوگوں نے انہیں "غریبوں کے جیل گھر" کہنا شروع کر دیا۔

26۔جگن ناتھ۔ہندومت میں بھگوان وشنو کا ایک روپ۔اس مت کے ماننے والوں میں مذہبی جنون اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ رتھ یاترا کے موقع پر بعض لوگ خود کو جگن ناتھ کے بھاری بھرکم رتھ کے نیچے ڈال دیا کرتے تھے اور ایسی موت کو شبھ سمجھتے تھے۔اب بھی یہ تیوہار بڑے پیمانے پر منایا جاتا ہے۔

27۔ "قانون مفلسی" جو 16 ویں صدی کے انگلینڈ میں جاری تھا، اس کے مطابق ہر ایک کھاتے پیتے زمیندار کو غریبوں کی بھلائی کے لئے ٹیکس دینا پڑتا تھا۔جو خاندان اپنی کفالت کے قابل نہ رہتے انہیں خیراتی سوسائٹیوں کے فنڈ سے مالی مدد دی جاتی تھی۔

28۔حوالے کے لیے ملاحظہ ہو ڈیوڈ ریکارڈو کی تصنیف "سیاسی معاشیات اور محصول لگانے کے اصولوں پر" (D.Ricardo On the Principles of Political Economy,and Taxation London,1821,p. 479.)

مارکس کی اس تحریر کو مارکسسٹ انٹرنیٹ آرکائیو، اردو سیکشن کے لئے ابن حسن نے ترتیب دیا۔

ٹائپ کمپوزنگ: ابن حسن، سجاد شاہ، احسن